

اسلامی معاشرہ

سورۃ حجرات کی روشنی میں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسینی ندوی
(ناظم قلمیہ اعلیٰ لکھنؤ)

(مرتب)

محمد ارمان بدایونی ندوی

سیدنا اجماع شہید ایکاد الہی

دار عرفات، نئی کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

ربیع الاول ۱۴۳۸ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۶ء

نام کتاب	:	اسلامی معاشرہ - سورۃ حجرات کی روشنی میں
مصنف	:	حضرت مولانا محمد عبدالرحمن خاں ندوی
مرتب	:	محمد ارمان بدایونی ندوی
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
صفحات	:	۱۰۴
قیمت	:	Rs. 40/-

باہتمام : محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب، ندوہ روڈ، لکھنؤ ☆ مکتبۃ اسلام، گوانن روڈ، لکھنؤ

ناشر

سید احمد رضا کیٹیگری
دارعہ عرفات، رائے بریلی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

عرض ناشر ۷

مقدمہ ۱۰

اسلامی معاشرہ

عظمت نبی ﷺ ۲۳

شعائر اللہ ۲۵

آپ ﷺ کی شخصیت ۲۷

ایمان کامل کا تقاضہ ۲۸

شعائر اللہ میں شامل دیگر چیزیں ۲۹

اللہ کے رسول کا احترام ۳۰

اخلاق نبوی اور اہل ایمان کی ذمہ داری ۳۳

- ۳۵ گفتگو کا انداز
- ۳۶ دلوں کا امتحان
- ۳۸ باشندگان عرب کا مزاج
- ۳۹ بعض نا سمجھ بدو
- ۴۰ صبر کی تعلیم اور اس کی حکمت
- ۴۲ عظمت نبوی کا تقاضہ
- ۴۲ ملاقات کے آداب
- ۴۵ خبر کی تحقیق کا فائدہ
- ۴۷ موجودہ دور کا ایک عام مرض
- ۴۸ عدم تحقیق کا نقصان
- ۴۹ ٹوٹ
- ۵۰ اہل ایمان سے خطاب
- ۵۳ صحابہ کرام کی رائے پر عمل
- ۵۸ منع حقیقی
- ۶۰ صلح و انصاف کی تعلیم
- ۶۲ رائے کی عصیت

- ۶۳ اخلاقی برائیاں
- ۶۷ ممانعت کی حکمت
- ۶۹ موجودہ دور کا المیہ
- ۷۰ تین مہلک بیماریاں
- ۷۳ تجسس
- ۷۴ غیبت
- ۷۶ غیبت کی قرآنی مثال
- ۷۷ عمل کی بنیاد
- ۷۸ قرآن کی تعلیم مساوات
- ۸۲ مؤمن یا مسلم
- ۸۵ اہل ایمان کی شان امتیازی
- ۸۶ اللہ کا علم
- ۸۸ خدا کا احسان
- ۸۹ علام الغیوب
- ۹۰ غیب کی باتوں پر یقین
- ۹۳ تخلیق آدم کا مقصد

۹۶ مشیت الہی

۹۷ امتیازی وصف

۹۹ دین و شریعت کی جامعیت

۱۰۲ خلاصہ

۱۰۳ دعا



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے، زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، اسلام نے ہر موقع کے لیے ایسی تعلیمات دی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے والا ایک کامیاب زندگی گزارتا ہے، سماجی زندگی کے لیے بھی اس کی معتدل اور مکمل ہدایات ایسی ہیں کہ وہ دنیائے انسانیت کے لیے ایک بیش بہا عطیہ ہیں، قرآن مجید میں جا بجا اس کی تفصیلات ملتی ہیں، اور رسول اکرم ﷺ کی زندگی ان کی بہترین تفسیر ہے۔

صحیح اور مکمل اسلامی زندگی کا تصور ان جامع ہدایات کے بغیر ممکن نہیں، ایک بڑا طبقہ ان سماجی ہدایات و تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے مسلمان ہونے کے باوجود اس کی صحیح ترجمانی نہیں کر پاتا، اس کے نتیجے میں اسلام کی نہایت نامکمل تصویر دنیا کے سامنے آتی ہے، اور لوگ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، آج اس کی بڑی ضرورت ہے کہ

ان سماجی اصلاحات کی طرف توجہ کی جائے، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ان کو تحریر و تقریر کا موضوع بنا یا جائے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ اس موضوع پر آیات موجود ہیں، البتہ سورہ حجرات مکمل ایک ایسی سورت ہے جس میں سماجی خرابیوں کا بھی تذکرہ ہے، اور اس کی اصلاحات کے نسخے بیان کئے گئے ہیں، یہ اسلامی معاشرہ کے لیے ایک دستور العمل ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو عمل میں لایا جائے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔

پیش نظر کتاب ”اسلامی معاشرہ“ کے نام سے سورہ حجرات کی ایک تفسیر و تصویر ہے، جو درحقیقت عم محروم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ان دروس کا مجموعہ ہے جو حضرت والائے رمضان المبارک میں دیئے تھے، اور اس میں سورہ حجرات کی تفسیر فرمائی تھی، حضرت کا انداز بہت رواں، موثر اور سہل ہے، اور ذیل میں اس کے اندر بہت سی ایسی باریکیاں بھی آگئی ہیں جو بعض مرتبہ تفسیر کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ملتیں، بڑی خوشی کی بات ہے کہ عزیز القدر مولوی محمد ارمغان ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے ٹیپ کی مدد سے دروس نقل کئے، ان کو

مرتب کیا، ذیلی عناوین لگائے، اب یہ ایک مکمل کتاب کی شکل میں سامنے ہے، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزیز موصوف نے بڑے سلیقہ سے کام کیا ہے، یہ وقت کی ایک ضرورت ہے، ہمیں امید ہے کہ عمومی طور پر اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا، اللہ تعالیٰ حضرت کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کے فیض کو عام فرمائے، اور عزیز موصوف کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازے اور ان کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۷/ صفر ۱۴۳۸ھ

دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں (رائے بریلی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، وختاتم النبيين، سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، وبعد!

اسلام اور دوسرے مذاہب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہر مذہب فرد کو خطاب کرتا ہے، اور اس کی زندگی میں اصلاح اور بندہ اور خالق کے درمیان تعلق اس مذہب کے اعتبار سے قائم کرتا ہے، اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین اور دنیا کو جمع کرنے کے لیے فرد، خاندان، سماج اور پوری انسانیت کے درمیان رابطہ کو اہم مقصد قرار دیتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے:

”خیر کم خیر کم لأہله وأنا خیر کم لأہلی“ (۱)

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے
سب سے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں
سب سے بہتر ہوں)

اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ قرآن کریم میں خدا کے حق کے ساتھ
والدین کے ساتھ حسن سلوک کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ
إِحْسَانًا﴾ (النساء: ۳۶)

(اور اللہ کی بندگی کرتے رہو اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک
مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو)

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا
إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ
لَهُمَا قَوْلٌ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا﴾ (الاسراء: ۲۳-۲۴)

(اور آپ کے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ تم سب صرف اسی کی
بندگی کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک (کرو) اگر

تمہارے پاس دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اُف بھی مت کرنا اور نہ ہی ان کو جھڑکنا اور ان دونوں سے عزت کے ساتھ بات کرنا، اور ان دونوں کے سامنے سراپا رحمت بن کر نرمی کے ساتھ جھکے رہنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں ہمیں پالا)

والدین کے حسن سلوک کے ذکر کے ساتھ خاندان کے ہر فرد کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر لایا گیا ہے، اور ان ساری باتوں سے منع کیا گیا ہے جو ان تعلقات کو خراب کر سکتی ہیں، اس سلسلہ میں قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں بڑی تفصیل ہے اور ان سارے اعمال سے روکا گیا ہے جن سے یہ تعلقات متاثر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بدگمانی اور شک سے بھی منع کیا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ
الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ
أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ
إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ﴾ (الحجرات: ۱۲)

(اے ایمان والو! اکثر گمانوں سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ

ہوتے ہیں، اور نہ ٹوہ میں رہو اور نہ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرو، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم گھن کرو گے ہی، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، رحم فرماتا ہے)

والدین کے حسن سلوک کے ساتھ اولاد اور بھائیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا ذکر ہے اور اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

شوہر اور بیوی کے تعلقات جو خاندان کے لیے بہت زیادہ اہم ہوتے ہیں، اسی طرح تجارت اور میراث کی تقسیم کے مسائل جو اکثر تنازعات کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کی رہنمائی کا ذکر کیا گیا اور اس کے اصول و ضوابط بیان کیے گئے ہیں۔

معاشرہ میں امیر و غریب، طاقتور اور کمزور افراد کی حیثیتیں ہوتی ہیں جن کے لیے مقررہ حقوق تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے رو سے انفرادی زندگی، خاندانی زندگی، سماجی زندگی، اقتصادی زندگی، سیاسی زندگی اور اخلاق و کردار، ان سارے پہلوؤں پر قرآن کریم میں روشنی ڈالی گئی ہے، حتیٰ کہ تیز آواز سے بولنا جو دوسرے کے لیے باعث تکلیف ہو، مثلاً سخت لہجہ، اور ایسی چال چلنا جس سے تکبر اور غرور ظاہر ہو، تمسخر اور دوسرے کی شان میں جارحانہ الفاظ استعمال کرنا، ان سب سے منع کیا گیا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ، وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾
(لقمان: ۱۸-۱۹)

(اور لوگوں کے لیے گال مت پھلاؤ اور نہ زمین میں اکثر کر چلو، بلاشبہ کسی اکثرنے والے اترانے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا، اور درمیانی چال چلو اور آواز دھیمی رکھو یقیناً بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے)

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا﴾
(الاسراء: ۳۷-۳۸)

(اور زمین میں اکثر کر مت چلو، نہ تم زمین ہی کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی لمبے ہو کر پہاڑوں تک پہنچ سکتے ہو، یہ ساری چیزیں (ایسی ہیں کہ) ان کی خرابی آپ کے رب کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے)

غصہ جو اکثر معاملات اور تعلقات کو متاثر کر دیتا ہے اور غصہ کی ہی وجہ سے اکثر آدمی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جس سے نتائج خراب ہو جاتے

ہیں، اس سے روکا گیا ہے:

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ
الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(آل عمران: ۱۳۴)

(جو خوشی اور تنگی میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور غصہ کو پی
جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ
بہتر کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)

اختلاف میں حلم و تحمل، عفو و درگزر اور مصالحت کو ترجیح دی گئی ہے،
حجت اور خاصمہ سے روکا گیا ہے۔

آداب حیات میں قرآن مکمل دستور ہے، عبادات، معاملات اور
سلوک کے سارے پہلو قرآن میں آگئے ہیں، اس کے لیے بعض جگہ عقیدہ
کی شکل میں اور بعض جگہ براہ راست رہبری کے انداز میں احکام آئے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن
يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن
يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا
بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقِ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ
يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (الحجرات: ۱۱)

(اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کی ہنسی کریں، بہت ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ برے ناموں سے پکارو، ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی برا ہے، اور اور جنہوں نے توبہ نہیں کی تو وہی نا انصاف ہیں)

عام زندگی کے علاوہ حالت جنگ کے احکام و آداب قرآن کریم نے بیان کیے ہیں، ہدایات دی ہیں اور حسن سلوک کی تلقین کی ہے، غیر مقاتل کے ساتھ حسن سلوک کو ترجیح دی ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ﴾
(التوبہ: ۶)

(اور اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دیجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی اطمینان کی جگہ پہنچا دیجیے یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو جانتے نہیں)

قتل نفس اور قتل اولاد کو قرآن کریم نے بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ
فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا
النَّاسَ جَمِيعًا﴾ (المائدة: ۳۲)

(جس نے بھی بغیر کسی جان کے یا بغیر زمین میں بگاڑ کے
کسی کو (ناحق) قتل کر دیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر
ڈالا اور جس نے کسی کی جان بچالی تو اس نے گویا تمام
انسانوں کو بچالیا)

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَأَبَاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءًا كَبِيرًا﴾ (الاسراء: ۳۱)
(اور مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل مت کر دینا، ان کو اور
تمہیں رزق ہم ہی دیتے ہیں یقیناً ان کو مار ڈالنا بہت بڑی
چوک ہے)

بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل کی قرآن میں بہت

وضاحت ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى
أَنْ تَكْرَهُنَّ شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾
(النساء: ۱۹)

(اور ان کے ساتھ اچھی گذر بسر رکھو، اور اگر تم ان کو پسند نہیں بھی کرتے تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اس میں اللہ نے بہت کچھ بہتری رکھی ہو)

اور اگر تعلقات قائم نہ ہوں اور جدائی یقینی ہو تو اس کو قرآن شریف میں حسن سلوک کے ساتھ انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿وَإِنْ حِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾
(النساء: ۳۵)

(اور اگر تمہیں ان دونوں کے آپس کے توڑ کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک فیصلہ کرنے والی عورت کے خاندان سے کھڑا کرو اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں جوڑ پیدا فرما دے گا، بیشک اللہ خوب جاننے والا پورا باخبر ہے)

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبَّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأُمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾

(البقرة: ۲۳۱)

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی (عدت کی) مدت کو پہنچیں تو یا تو بہتر طریقہ پر ان کو روک لو یا اچھی طرح سے رخصت کر دو اور ان کو نقصان پہنچانے کے لیے مت روکنا کہ تم زیادتی کرنے لگ جاؤ اور جس نے ایسا کیا تو اس نے اپنے ساتھ ظلم کیا)

غیر مسلموں کے معبودوں کے بارے میں ہدایات ہیں کہ ان کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں جن سے ان کے ماننے والوں میں رد عمل ہو:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيْنًا لِّكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

(الأنعام: ۱۰۸)

(اور جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں تم ان کو برا بھلا مت کہو

کہ وہ نا سمجھی میں حد سے آگے بڑھ کر اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں)

اس طرح مسلم معاشرہ اور غیر مسلم معاشرہ کے درمیان بھی خوشگوار

تعلقات قائم ہوں گے، اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کے عقائد اور طرز

زندگی سے محفوظ رہا جائے۔

اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں خاندان اور سماج کے، قوم اور افراد کے پورے ماحول میں ایک مسلمان تعمیر کا سبب بنے، نہ کہ تخریب کا سبب، قرآن کہتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا
وَيُكْفِرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ﴾ (الأنفال: ۲۹)

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا لحاظ رکھو گے تو وہ تمہیں ایک امتیاز عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تو بڑے فضل والا ہے)

اگر ان سب آداب کا خیال رکھا جائے تو مسلمان سماج میں ایک مثالی شخصیت بن سکتا ہے۔ سیرت میں اس کی مثال ملتی ہے کہ مشرکین اور اسلام دشمن حضور صلی اللہ علیہ کے پاس امانتیں رکھتے تھے اور حجر اسود کی تنصیب پر جب اختلاف ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنانے پر سب متفق ہو گئے اور کہا:

”هذا الأمين رضينا به“

(یہ تو امانت دار ہے، ہم اس سے راضی ہیں))

اسلام نے زندگی کے مسائل جو طبعی ہیں، ان کے حل پیش کیے

ہیں۔ وہ بعض موقعوں پر صالحین امت اور ملوک کے حقوق میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض جگہوں پر براہ راست مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے۔

اس دور کا سب سے بڑا مرض ”اَنَا“ ہے یعنی اپنی ذات، اس کے بعد اپنا خاندان، اس کے بعد اپنی قوم، اس کی وجہ سے ساری دنیا میں کشمکش اور جھگڑے ہو رہے ہیں، قرآن کریم میں اس تقسیم کو ختم کیا گیا اور اس کو انتظامی قرار دیا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ
وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ
اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (الحجرات: ۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے خاندان اور برادریاں بنا دیں تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ اللہ کے یہاں تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا پرہیزگار ہو، بے شک اللہ خوب جانتا، خوب خبر رکھتا ہے)

مغربی نظام تعلیم و تربیت نے فرد کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، جبکہ اسلام پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور اس کی اصلاح اور تعمیر پر زور دیتا ہے، قرآن کریم اور حدیث شریف میں اس موضوع پر بہت زور

دیا گیا ہے۔

مغربی تمدن نے سماج کے تصور کو ختم کر دیا ہے، وہاں اب نہ تو خاندان کا تصور ہے نہ معاشرہ کا، بلکہ صرف ذات اس لیے وہاں معاشرہ کا تصور نہیں، والدین اور اولاد کے درمیان سب لحاظ ختم ہو گیا ہے، تو معاشرہ کا کیا ذکر؟، اسی طرح محبت، رحم، ہمدردی اور آپس میں تعاون کا تصور ختم ہو گیا ہے، اور ذاتی مفاد کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے، یہ رجحان اب مشرق میں وسائل ابلاغ، نظام تربیت اور سیاحت و سفر کے دوران آپس میں اختلاف کے ذریعہ عام ہو رہا ہے، یہ رجحان مذہب اور اخلاق کے خلاف تو ہے ہی؛ اسلام کی تعلیم کے بہت منافی ہے، اس ماحول میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ فرد کی زندگی کی اصلاح کے ساتھ سماج کی اصلاح کی بھی فکر کی جائے۔

سورہ حجرات ایک ایسی سورہ ہے جس میں اس طرح کے مختلف آداب کا ذکر ہے، برادر معظم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا رمضان میں معمول رہتا ہے کہ وہ درس قرآن میں ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن میں آداب زندگی بیان کیے گئے ہیں، تاکہ ان کو زندگی میں اختیار کیا جائے اور اس وقت سماج میں جو کرپشن ہے اور دینی حلقوں میں جو کمیاں پائی جاتی ہیں وہ دور کی جاسکیں، سورہ حجرات پر ان کا

جو درس ہوا تھا، اس کو اس رسالہ میں پیش کیا گیا ہے، یہ ٹیپ رکارڈ میں محفوظ تھا، اس خطاب کو عزیز می محمد ارمان ندوی نے نقل کیا اور صحیح و اضافہ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے تاکہ سامعین کے ساتھ قارئین بھی مستفید ہو سکیں، امید ہے یہ رسالہ اصلاح معاشرہ میں اہم رول ادا کرے گا، واللہ ولی التوفیق۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی
 معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
 منگل، ۳۰ محرم ۱۴۳۸ھ - یکم نومبر ۲۰۱۶ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلامی معاشرہ

سورہ حجرات میں مومنین کو آداب معاشرت سکھائے گئے ہیں، انسانی زندگی عبادات پر مشتمل ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانا، عبادت کا فرض انجام دینا، دوسرے یہ کہ آپس کی زندگی میں لوگوں سے جو تعلقات و معاملات ہوتے ہیں ان کا لحاظ کرنا، بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ہر چھوٹے بڑے کا فرق کرنا، ایک دوسرے کا خیال رکھنا، کسی سے بھی ہر بات نہ کہنا، بغیر تحقیق کے کوئی اقدام نہ کرنا، کیونکہ بسا اوقات بغیر تحقیق کے کارروائی کرنے پر نتائج برے نکلتے ہیں، اس لیے کہ وہ بات خلاف واقعہ ہوتی ہے۔

عظمت نبی ﷺ

معاملات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک مومن کا اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ عام انسانوں سے بالکل الگ معاملہ ہونا چاہیے،

یہ چیز خاص طور پر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ زیادہ تھی، کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں ہر وقت اللہ کے رسول ﷺ کا سامنا تھا، اسی لیے یہ تعلیم دی گئی کہ عام انسانوں کے مقابلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ بلند معاملہ ہونا چاہیے، زیادہ مہذب طریقہ سے پیش آنا چاہیے، آپ ﷺ کے سامنے بڑھ بڑھ کر بات نہیں کرنی چاہیے، اپنی بات کو اونچے انداز میں پیش نہیں کرنا چاہیے، یہ ذہن میں ہونا چاہیے کہ تم ایسے نبی کے سامنے بیٹھے ہو، جس کا تعلق آسمان سے قائم ہے، جس پر وحی نازل ہوتی ہے، اللہ کا پاکیزہ کلام اس پر نازل ہوتا ہے، گویا ایک آسانی چیز اس تک پہنچتی ہے جو عام انسانوں تک نہیں پہنچتی۔

شعائر اللہ

عظمت نبوی ﷺ کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ اس دنیا میں چار چیزیں ایسی ہیں جن کی بنیاد پر اس کو برتری حاصل ہے، ورنہ یہ دنیا آسمان کے مقابلہ میں بہت حقیر چیز ہے، اگر آسمان کی چیز زمین پر آجائے تو زمین اس کا تحمل نہیں کر سکتی، جیسے بہت بھاری پتھر مٹی پر رکھ دیا جائے تو مٹی دب جائے گی، یا لوہے کے سامنے لکڑی آجائے تو لوہے کے سامنے لکڑی کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی، اسی طرح یہ زمین آسمان کے سامنے بہت حقیر اور کمزور ہے، ان چار

اہم چیزوں میں پہلی چیز آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے، حضور ﷺ کی تعظیم شعائر اللہ میں داخل ہے، کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا لیا ہے، اور صاف فرمادیا ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(آل عمران: ۳۱)

(اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا نہایت رحم والا ہے)

اس آیت سے حضور ﷺ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ایک دوسری جگہ پر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا گیا دیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(الاحزاب: ۲۱)

(اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے)

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے انسان کا لیل بنا دیا، جیسے کوئی ماڈل یا نمونہ ہوتا ہے اس کو دیکھ کر آدمی کسی چیز کی حقیقت کو سمجھتا ہے، اور غور کرتا ہے کہ کس طرح اس کی نقل کی جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسان کا

اعلیٰ نمونہ بنایا، اب اگر کوئی شخص بہتر سے بہتر انسان بننا چاہتا ہے تو وہ حضور ﷺ کی نقل کرے، آپ کے طریقہ کو اختیار کرے، آپ کی سنت پر عمل کرے، تو وہ اللہ کے یہاں محبوب و مقرب ہو جائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت

چونکہ آپ ﷺ کی شخصیت کا شمار شعائر میں ہوتا ہے، اس لیے آپ کا احترام کرنا، آپ کی بات پر عمل کرنا، آپ کے حکموں کی تعمیل کرنا، آپ سے محبت کرنا، ہم سب پر لازمی ہے، محبت کرنے کی بات تو یہاں تک کہی گئی ہے کہ آدمی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت اپنے ماں باپ، اپنی اولاد سے بھی زیادہ نہ ہو، یعنی ماں باپ سے زیادہ محبت اللہ کے رسول ﷺ سے ہونی چاہیے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”لَا يَزَالُ يُبْعَثُ رُسُلًا حَتَّىٰ يَأْتِيَ الْبَشَرُ بِالنَّبِيِّ الْكَافِرِ“

”وولده والناس أجمعين“ (۱)

(تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک تمہاری محبت اللہ کے رسول سے ماں باپ، اولاد اور ہر

چیز سے زیادہ نہ ہو)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کسی صحابی سے ان کے شہید کئے جانے کے وقت یہ معلوم کیا جاتا کہ بتاؤ کیا تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شہید کر دیا جائے تم اس پر راضی ہو؟ وہ جواب دیتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاٹنا بھی چھبے ہم کو یہ بھی گوارا نہیں، چہ جائیکہ ان کو شہید کر دیا جائے، صحابہ کرام کو واقعی ایسی ہی محبت تھی، اور اسی محبت کا مطالبہ سارے امتیوں سے ہے کہ آپ سے ایسی محبت ہو جو سوائے اللہ کے کسی سے نہ ہو، نہ ماں باپ سے، نہ اولاد سے، نہ مال و متاع سے، کسی بھی چیز سے اتنا لگاؤ، اتنی محبت نہ ہو جتنی اللہ کے رسول سے ہو، کیونکہ جب محبت ہوگی تو انسان آپ کے نمونہ پر عمل بھی کرے گا، آپ کی سنت کی پیروی بھی کرے گا اور آپ کی ہر ہر چیز کو اچھا بھی سمجھے گا۔

ایمان کامل کا تقاضہ

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کہ اس کو اللہ کے رسول سے کتنی محبت ہے، اس محبت کا اندازہ صرف کہنے سے نہیں بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے مقابلہ میں کوئی چیز آجائے، عموماً آدمی کو دنیا کے منافع، مال و متاع اور اولاد سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اس سے دین کے معاملہ میں خلل پڑنے لگتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے

اس سے روکا اور یہ فرمادیا کہ تمہاری اولاد، تمہارا مال و دولت تمہارے لیے فتنہ ہے، فتنہ کے معنی عربی میں لبھا کر آدمی کو اصل راستہ سے ہٹانے کے ہیں، یعنی آدمی شوق میں غلط کام کرنے لگے، کسی چیز کو اتنا پسند کرے اور اس سے اتنا لگاؤ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ غلط کام کر دے، لیکن اللہ کے رسول سے آدمی کو اگر صحیح محبت ہو، جیسی محبت کا مطالبہ ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوگا، تو پھر وہ شخص ہزار چیزوں کے باوجود بھی اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں کر سکتا، کیونکہ انسان کو جس سے محبت و عقیدت ہوگی وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، لہذا ایمان کے مکمل ہونے اور شریعت پر صحیح عمل کے لیے ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ایسی محبت ہو۔

شعائر اللہ میں شامل دیگر چیزیں

شعائر اللہ میں دوسری چیز بیت اللہ شریف ہے، جس کا آسمان سے خاص ربط ہے، وہاں آسمان سے نوار نیت کا نزول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ آسمان کے ربط کو برداشت کر سکے، تیسری چیز نماز ہے، جس کو مومنین کی معراج بتایا گیا ہے، چوتھی چیز قرآن مجید ہے، جس کے متعلق آتا ہے کہ اگر ہم اس کلام کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو پہاڑ پھٹ جاتے، کیونکہ وہ اس کلام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا

خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنا مبارک کلام اس ترتیب سے اتارا کہ انسان اس کو برداشت کر لیتا ہے، ورنہ اگر بغیر کسی واسطہ کے اتارا جاتا تو اس کا برداشت کرنا مشکل تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کلام کو سب سے پہلے حضرت جبرئیل کو دیا، ان کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ پر نازل ہوا، اور اس طرح درمیان میں ان دو واسطوں کے بعد یہ کلام الہی ہم تک پہنچا۔

اللہ کے رسول کا احترام

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقَدَّمُوا بَيْنَ يَدَيْ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَأَتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

(الحجرات: ۱)

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے! تم اللہ اور اس کے رسول کے سامنے آگے بڑھ کر نہ آؤ اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے خوب جانتا ہے)

مذکورہ بالا تشریح سے معلوم ہوا کہ نبی پاک ﷺ کا معاملہ عام انسانوں سے بالکل جدا ہے، ان کو اپنے جیسا سمجھنا ہرگز درست نہیں، اور اتنا بڑا سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ ان کو انسان کے بجائے خدا سمجھ لیا جائے، بلکہ وہ ایک انسان ہی ہیں، البتہ عام انسانوں سے اس طور پر ممتاز ہیں کہ ان کا آسمان سے خاص ربط ہے، جو ہر شخص کا نہیں ہو سکتا، اس لیے

ان کی عظمت کو سمجھنا ہوگا، یہ خیال رکھنا ہوگا کہ تم ان سے بہت چھوٹے ہو اور وہ بہت بلند مقامات پر فائز ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورہ حجرات کی ابتدائی آیات میں اہل ایمان کو اسی بات کی تعلیم دی گئی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے آگے بڑھ کر بات نہ کریں، برابری کا معاملہ نہ کریں، اس آیت میں ”رسول“ کہہ کر یہ بتا دیا گیا کہ ان کی حیثیت عام انسانوں سے ہٹ کر اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ”رسول“ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ عزت حاصل ہے، اسی لیے ان کا یہ مقام ہے، گویا ان کا احترام اللہ تعالیٰ کا احترام ہے، اور اصل احترام و عظمت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اور اس کے ساتھ ہر اس چیز کی ہے جس کا اس سے خاص تعلق ہو، اس سے خاص تعلق والی چیزوں میں اس کے رسول کی ذات اول نمبر پر ہے، اس لیے ان کی عظمت ہر حال میں ضروری ہے، کیونکہ یہ صفت ہر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی، اسی لیے عظمت نبوی ﷺ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یہ اس لیے کہا گیا کہ اگر ہم نے عظمت کے تقاضوں کا مکاحقہ خیال نہیں رکھا تو اللہ تعالیٰ کو یہ چیز ناپسند ہوگی، جس کے نتیجے میں ہم گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مبغوض قرار پائیں گے، (العیاذ باللہ) جس کے بعد دنیا اور فرشتے یا حالات ہم میں سے ایسے شخص کا کچھ بھی ساتھ نہیں دے سکیں گے، یہ الگ بات ہے

کہ اللہ تعالیٰ موقع دے سکتا ہے، جیسا کہ اس نے اس دنیوی زندگی میں ہر ایک کو موقع دیا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہے، گویا ہماری یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کا بہترین موقع ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اکثر احکامات کے ضمن میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ کے معاملہ میں احتیاط والا طریقہ اختیار کرو، اسی طرح جو چیز اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھتی ہے اس کا احترام کرو، تاکہ تمہیں نقصان نہ پہنچے۔

بے تکلف زندگی میں آدمی جس طرح گھر میں ہوتا ہے کہ بیٹا باپ کا اس طرح احترام نہیں کر پاتا جیسا کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہر وقت کا ملنا جلنا ہے، اور ہر وقت ملنے جلنے میں بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح صحابہ کرام کو ہر وقت حضور ﷺ سے جو واسطہ پڑتا تھا تو اس کا امکان ہو گیا تھا کہ وہ اتنا احترام اور اتنا خیال نہ کر سکیں جتنا کرنا چاہیے، اور اس میں بعض مرتبہ کچھ لوگوں سے غلطی بھی ہوئی، اس لیے قرآن مجید میں اللہ کا صاف صاف حکم آ گیا کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے، یعنی نبی ﷺ کے سامنے اپنے کو نہ بڑھاؤ، اپنے کو چھوٹا رکھو، ان سے معاملہ کرنے، بات کرنے میں یہ نہ ہو

کہ تم بات کرنے میں آواز بلند کرنے لگو، اس کے بعد اللہ سے ڈرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ مسلمانوں کی یہ حرکت اللہ کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے رسول جس کو اس نے اپنا لیا ہے اور مخصوص کر لیا ہے اس کے سامنے تم برابری کا معاملہ کرو، ان سے بحث کرو یا ان کی بات میں دخل دو۔

اخلاق نبوی اور اہل ایمان کی ذمہ داری

حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ ﷺ کی شفقت، آپ کا کرم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی آپ کی توہین کرے تو آپ اس کا بدلہ نہیں لیتے تھے، کوئی سختی سے پیش آتا تھا آپ کچھ نہ کہتے تھے، حتیٰ کہ اگر کبھی آپ نے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا تو لوگ پہلے سے آ کے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے، جس سے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو دشواری ہوتی، اس پر بھی آپ کچھ نہیں فرماتے، بلکہ آپ برداشت کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی صاف صاف قرآن مجید میں فرما دیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر تم نبی کے یہاں کھانا کھانے جاؤ تو پہلے سے نہ جاؤ، جانے کے بعد زیادہ دیر نہ بیٹھو، اور فوراً وہاں سے ہٹ جاؤ کیونکہ اس عمل سے نبی کو تکلیف ہوتی ہے، غرض کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے احترام کی جگہ جگہ

تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ نبی عام انسان نہیں ہے، اللہ نے ان کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے، اس لیے اب ان کو اللہ کی طرف سے ایک حصار حاصل ہو گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے آدمی ہو گئے ہیں، اس کے مخصوص ہو گئے ہیں، اب اگر ان کے ساتھ کوئی ناروا معاملہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو برا لگے گا، اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئے گی کہ جن کو اللہ نے اپنا لیا ہے اور اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے، ان کو کوئی شخص عام آدمی یا اپنا ساتھی یا عزیز سمجھے۔

آیت کے اخیر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے، خوب جانتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص عظمت نبوی ﷺ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے میں دھوکہ سے کام لینا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے دل سے واقف ہے، جو شخص اخلاص سے عظمت کے ساتھ پیش آئے گا وہ بھی اللہ بخوبی جانتا ہے اور جو شخص صرف الفاظ اور اپنی آواز سے احترام کرے گا اس سے بھی اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے، گویا اس کے ذریعہ یہ بتا دیا گیا کہ ہمارے دل میں ہر وقت یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہم سے بڑے ہیں، قابل احترام ہیں، ہمیں ہرگز ان کے ساتھ برابر کی معاملہ نہیں کرنا ہے، کیونکہ ہماری تمام حرکات و سکنات سے اللہ تعالیٰ واقف ہے، وہ خوب سنتا ہے اور خوب جانتا ہے۔

گفتگو کا انداز

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ
صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ
لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

(الحجرات: ۲)

(اے ایمان والو! تم اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور ان سے کھل کر بات نہ کرو، جیسے تم میں سے بعض بعض کے ساتھ (بات) کرتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال بے کار ہو جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو)

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اہل ایمان جب آپ ﷺ سے گفتگو کریں تو ان کی آواز آپ ﷺ سے پست ہونا چاہیے، جس لہجہ میں آپ ﷺ بات کر رہے ہوں، اس سے ہلکا، جھکا ہوا اور ادب والا لہجہ اہل ایمان کا ہونا چاہیے، جب تک آپ ﷺ کی مجلس میں رہیں تب تک مکمل احتیاط کرنی چاہیے، جس طرح آپس میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بے تکلفی کی باتیں ہوتی ہیں، اس طرح کھل کر آپ ﷺ سے بات نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جو چیز بھی معلوم کرنا ہو اس میں غایت درجہ ادب کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ وہ تمام انسانوں میں سب سے

افضل ہیں، ان کا مقام نہایت بلند و بالا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کے اس مقام کو ذہن میں نہ رکھو اور ان سے بے تکلفی کی بات کر بیٹھو، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارے تمام اعمال بے کار ہو جائیں اور تمہیں اس کا احساس بھی نہ ہو، اس لیے کہ تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ ہم نے دنیا میں اچھے اعمال کئے ہیں، حالانکہ وہ اعمال ایک ایسی معمولی غلطی اور بے ادبی کے نتیجہ میں جپٹ ہو چکے ہوں گے جو غلطی تمہاری نظر میں اتنی بڑی نہیں تھی۔

دلوں کا امتحان

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَعْضُونَ أَصْوَابَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِتَتَّقُوا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾
(الحجرات: ۳)

(بے شک جو لوگ اپنی آواز کو اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کا اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے امتحان لیا، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی معافی اور بڑا اجر ہے)

اس آیت میں تقویٰ کے لیے دلوں کے امتحان لینے کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے دلوں میں تقویٰ دیکھا، ان کے متعلق آتا ہے کہ وہ نہایت ادب اور ڈر کے ساتھ اللہ کے

رسول ﷺ سے بات کرتے، بعض دفعہ اتنی آہستہ بات کرتے کہ پوچھنا پڑتا تھا کہ انہوں نے کیا کہا، بالخصوص ان آیات کے نزول کے بعد وہ لوگ مزید محتاط ہو گئے تھے، اس لیے کہ اس کا بھی حکم دیا گیا تھا کہ جب نبی کوئی بات کہے تو نہ زیادہ سوال کرو، نہ ہی زیادہ پوچھو، وہ جتنی بات بتادیں بس اسی پر اکتفا کرو اور اسی سے مطلب سمجھ لو، اسے کریدو نہیں، اسی لیے نصیحت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا قصہ ذکر کیا، جس میں زیادہ سوال کرنے کے نقصان کو واضح کیا گیا ہے، بنی اسرائیل سے جب گائے کی قربانی کو کہا گیا تو وہ پوچھنے لگے کہ گائے کیسی اور کس طرح کی ہو؟ جس کی بناء پر انہوں نے اپنے لیے راستہ تنگ کر دیا، اسی لیے حضور ﷺ نے زیادہ سوالات کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ اس سے لوگوں کو خود تنگی ہو جائے گی، جب اللہ تعالیٰ نے کسی سلسلہ میں ایک عام بات کا حکم دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور جس طرح سے جو ہو سکتا ہو وہ کرنا چاہیے، اس میں تکتے نہیں نکالنا چاہئیں، اسی لیے حضور ﷺ کے متعلق آتا ہے کہ آپ ﷺ جو فرمائیں اسے سن لو، اس پر عمل کرو، زیادہ پوچھو نہیں، زیادہ کریدو نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب ان کو حضور ﷺ سے کوئی چیز معلوم کرنی ہوتی تھی تو سوچتے تھے کہ کس طرح پوچھیں، کہیں گستاخی نہ ہو جائے، اسی

لیے کسی نہ کسی دیہاتی کے انتظار میں رہتے تھے کہ وہ اکھڑ آدمی پوچھ لے گا اور ہمیں بھی سننے کو مل جائے گا، اسی سورت میں ان دیہاتیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ دیہات کے لوگ آ کر تیز تیز بات کرتے ہیں یہ بہت برا کام کرتے ہیں، یہ اپنے کو نقصان پہنچاتے ہیں، البتہ وہ لوگ جو اپنی آواز کو اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے دبا لیتے ہیں، نیچی کر لیتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، یعنی یہ لوگ عمل میں صحیح ثابت ہوئے ہیں، رب العالمین کی جانچ میں صحیح اترے ہیں، جس طرح اللہ چاہتا ہے کہ اس کے رسول کے ساتھ نرم لہجہ اور آہستہ سے بات کی جائے، یہ لوگ اس کی احتیاط کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

باشندگان عرب کا مزاج

کسی سے بات کرنے کے سلسلہ میں عربوں کا مزاج بہت کھڑا تھا، وہ لوگ اپنے کو کسی دوسرے سے چھوٹا نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے بہت کھلے طریقہ سے ہر ایک کے ساتھ بات کرتے تھے، چونکہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ یہ طریقہ درست نہیں تھا، خواہ کسی کی تہذیب کچھ کہتی ہو، اس لیے قرآن مجید میں صاف طور پر ہدایات نازل ہوئیں، اور اس کے لیے ان لوگوں کے دلوں کا امتحان تقویٰ کے مطابق لیا گیا، جس میں وہ

پورے اترے، وہ اس طرح جیسا کہ ابھی اوپر بتایا گیا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں بالکل خاموش رہتے، ادب کے ساتھ ایک ایک بات سنتے رہتے، زیادہ سوال کرنے سے بھی پرہیز کرتے، ان کے اسی ادب کی بنا پر آیت کے اخیر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو معافی دے گا اور ان کے لیے بہت اجر بھی رکھا گیا ہے۔

بعض نا سمجھ بدو

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنَ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۗ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (الحجرات: ۴-۵)

(بے شک جو لوگ آپ کو پکارتے ہیں آپ کے گھروں کے پیچھے سے، ان میں سے اکثر بات کو نہیں سمجھتے، اگر یہ لوگ صبر کرتے جب تک کہ آپ خود نہ نکلتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا، اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے اور رحم کرنے والا ہے)

ان آیات میں اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق ادب کی تعلیم دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض بدو اپنے مزاج کے مطابق آکر آپ ﷺ کے گھر کے باہری حصہ سے بلند آواز سے آپ ﷺ کو پکارتے تھے، ”اے محمد! اے محمد! باہر نکلو“ یہ وہ لوگ تھے جو گاؤں دیہات سے آتے

تھے، اور اکھڑ ہوتے تھے، تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے، بڑے سے کس طرح بات کرنا چاہیے، برابر والے اور چھوٹے سے بات کرنے کا کیا طرز ہونا چاہیے، ان لوگوں کو ان آداب کا کچھ بھی علم نہ تھا، ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ دیہات کے کچھ لوگ آئے، انہوں نے باہر سے محمد محمد پکارنا شروع کر دیا تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی بات سنا سکیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا یہ آواز لگانا کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض ناواقفیت کی بنیاد پر تھا، لیکن بے ادبی بے ادبی ہی ہوتی ہے خواہ بری نیت سے نہ ہو، ان لوگوں کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کے لیے ہرگز ناپسند تھا، اس لیے ان کی گرفت فرمائی، نبی کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے اس کی تعلیم دی، اور ان بدو لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی یہ حرکت ناواقفیت کی بنیاد پر ہے، انہوں نے یہ عمل اپنے مزاج کے مطابق کیا، انہیں یہ سمجھ نہیں ہے کہ وہ نبی پاک ﷺ کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، کس طرح بات کریں، ان کے مقابلہ میں نبی اکرم ﷺ کا مقام کس قدر بلند ہے۔

صبر کی تعلیم اور اس کی حکمت

دوسری آیت میں انہیں لوگوں کے متعلق کہا گیا کہ ان کے لیے بہتر بات تو یہ تھی کہ آپ ﷺ کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرتے، اس طرح آپ ﷺ کو پکارنا صحیح بات نہیں ہے، ممکن ہے اس وقت حضور ﷺ ایسی

حالت میں ہوں کہ اس حالت میں ان کے لیے نکلنا نامناسب ہو، لیکن آپ پکارے چلے جائیں گے تو اس بات سے ان کو خلل ہوگا اور اذیت بھی پہنچے گی، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ گھر کے اندر آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو جس کے اندر آپ ﷺ کو کسی کا پکارنا مناسب نہیں ہے، اس لیے باہر سے ہر شخص کو بے تکلفی کے ساتھ آواز دینے میں محتاط رہنا چاہیے، کیونکہ نبی ﷺ کا معاملہ عام انسانوں سے بالکل مختلف ہے۔

ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دیہات کے لوگوں کو مخاطب کر کے شہری لوگوں کی بھی تنبیہ کر دی کہ تم بھی اللہ کے نبی ﷺ کو معمولی نہ سمجھو، ان کا اللہ سے خاص تعلق ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے ان کو تم پر ایسی برتری حاصل ہوگئی ہے کہ کسی اور کو وہ برتری حاصل نہیں ہے، گرچہ وہ انسان ہیں لیکن اللہ نے ان کو اپنا لیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی پوری سرپرستی فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایات دیتا ہے، فرمان الہی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾

(النجم: ۳-۴)

(آپ جو بات بھی کہتے ہیں اپنے دل سے نہیں کہتے، بلکہ

اللہ کی طرف سے اشارہ اور رہنمائی کی بنیاد پر کہتے ہیں)

معلوم ہوا آپ ﷺ کے کہنے کو آپ کا کہنا نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ

درحقیقت وہ اللہ کا کہنا ہوتا ہے، البتہ آپ کے واسطے سے پہنچتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست کسی کو مخاطب نہیں کرتا، اگر اللہ تعالیٰ کی بات براہ راست آئے تو اس کو انسان برداشت ہی نہیں کر سکتا، خود آپ ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ پر اتنا بوجھ پڑتا تھا کہ آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، اور آپ کی کمر جھک جاتی تھی، اگر آپ سواری پر ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ ٹوٹ جائے گی، آپ کا گھٹنا کسی کے اوپر ہوتا تھا تو معلوم ہوتا تھا منوں بوجھ اس پر لد گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا بنایا تھا کہ آپ اتنا بوجھ برداشت کر لیتے تھے، اگر وہی وحی کسی دوسرے انسان پر اترتی تو وہ کچل کر مر جاتا، لیکن اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

عظمت نبوی کا تقاضہ

گویا ان تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقام کو اس طرح سمجھا جائے کہ ہمارے تمام معاملات میں اس کا اثر ظاہر ہو، نبی کے نام پر کسی بھی مجلس کے انعقاد کے وقت یہ احساس ہو کہ ہم کس کی بات سن رہے ہیں، کس کی مجلس میں بیٹھے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ایسی مبارک مجلسوں میں بھی شرکت ہو مگر اس کے باوجود ہم اپنے دوستوں سے ہم کلامی میں مست ہوں، یا ایسے بیٹھے ہوں جیسے اپنے کسی ہمسر کے سامنے بیٹھے

ہوں، کیونکہ نبی ﷺ کی ذات اقدس وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی عظمت عطا فرمادی ہے کہ آپ انسان ہیں مگر عام انسانوں کی طرح نہیں، حضور ﷺ فرماتے تھے کہ میں ایک انسان ہوں، جس طرح لوگ کرتے ہیں میں بھی کرتا ہوں، بس یہ ہے کہ اللہ نے مجھ کو نبی بنایا ہے، یہ جو اعزاز آپ کو ملا اس سے آپ اور انسانوں سے برتر ہو گئے لیکن انسان رہے۔

مندرجہ بالا آیات میں خاص طور پر عربوں کو ہدایت کی گئی، کیونکہ عربوں کا مزاج بہت بے تکلف مزاج تھا، وہ بادشاہ سے بھی خطاب ”تم“ سے کرتے تھے، عربوں کے یہاں یہ عجم سے تہذیب آئی، جو کہ ایک اچھی تہذیب ہے کہ مختلف لوگوں کے درجے کے مطابق ان سے معاملہ کرنا چاہیے، عرب بادشاہ سے یوں مخاطب ہوتے تھے جیسے کسی عام انسان سے، مثلاً: ”اے بادشاہ! تمہیں ایسا کرنا چاہیے“، بعض سادہ لوح عربوں نے حضور ﷺ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، لیکن عموماً یہ حال تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں، یعنی ہمت نہیں پڑی کہ آپ پر کھلی نگاہ ڈال لیں، کیونکہ آپ ﷺ کا غیر معمولی رعب تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو عربوں کی اس عادت کے مطابق خطاب کرنے والے کچھ نئے لوگ تھے، یا انہیں

پرانے لوگوں میں ایسے تھے، جو زور سے بات کرنے لگے، پکارنے لگے، اس لیے کہ کثرت کے ساتھ رہنے میں بے تکلفی ہو جاتی ہے، لہذا ہدایت دے دی گئی کہ ان سے اپنی آواز اونچی نہ کرو، بلکہ ان کی بات سنو، وہ تمہارے معلم ہیں، تمہارے ہادی ہیں، تمہیں ان سے کچھ لینا ہے، ان کی اطاعت کرنی ہے، ان سے برابری کا معاملہ نہیں کرنا ہے۔

ملاقات کے آداب

ان آیات میں گھر کے باہر سے پکارنے کے متعلق جو بات کہی گئی ہے، نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہی تھا، مگر یوں بھی عام انسانوں کے ساتھ بھی اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، بسا اوقات ہمارے معاشرہ میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی کے دروازے پر زور زور سے پکارتے رہتے ہیں، نہ جانے وہ شخص اندر کس حالت میں ہو، لیکن باہر والا شخص اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا، جب کہ یہ بد تمیزی کی بات ہے کہ انسان اندر سے کوئی جواب نہ ملنے کے باوجود مستقل آواز لگاتا رہے، ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان باہر کھڑے ہو کر جواب کا انتظار کرے یا ان کے نکلنے کا انتظار کرے، جن سے ملنا ہے ان کے وقت کو دیکھے کہ ان کا کون سا وقت خالی ہے، اس وقت ان سے بات کرے، سچی بات یہ ہے کہ آج یہ اسلامی تہذیب مسلمانوں کے درمیان سے اٹھ رہی

ہے، مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ انہیں اس سلسلہ میں کوئی پرواہ نہیں ہوتی، صرف اپنے کام سے کام رہتا ہے، دوسرا آدمی کس حالت میں ہو اس کا کوئی خیال نہیں ہوتا، بغیر کسی جھجک کے اندر گھستے چلے آتے ہیں، جس پر بعض وقت اندر والے شخص کو شرمندگی بھی ہو جاتی ہے، اندر والا شخص کپڑے پہن رہا ہو، یا استنجاء خانہ میں ہو، یا اپنے کسی اور ذاتی کام میں مصروف ہو، اور کوئی دوسرا شخص باہر سے ان کو آواز دیئے چلا جائے یا بغیر اجازت اندر گھستا چلا آئے یہ سب غیر اسلامی طریقے ہیں، اسی لیے اللہ نے قرآن میں اس ادب کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا، تاکہ تمام لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے ادب کے ساتھ چھوٹے بڑوں کے فرق کو بھی سمجھ سکیں، کس موقع پر کیا بات کہی جائے، کس موقع پر کس کو اپنی ضرورت بتائی جائے، کس موقع پر آدمی کو بلایا جائے، ان سب چیزوں کا خیال پیدا ہو سکے، اگر ان سب چیزوں کا خیال پیدا نہیں ہوتا تو پھر آدمی بے خیالی میں نہ جانے اپنے کن کن طریقوں سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

خبر کی تحقیق کا فائدہ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا
أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ

(الحجرات: ۶)

﴿نَادِمِينَ﴾

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے! اگر کوئی گناہ گار آدمی تم کو کوئی
خبر دے تو تم اس خبر کی تحقیق کر لو، ہو سکتا ہے کہ تم اپنی
ناواقفیت کی وجہ سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا دو اور پھر بعد
میں تمہیں نادم ہونا پڑے)

آداب معاشرت کی تعلیم دیتے ہوئے انسانی معاشرہ سے وابستہ
ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم لوگ جو آپس
میں باتیں کرتے ہو، اس میں احتیاط برتا کرو، معقول و متواضع انسان کی
طرح رہو، کسی بھی معاملہ میں جلد بازی مت کرو، اگر تمہیں کوئی ایسی بات
معلوم ہو جو قابل تنقید ہے تو فوراً اس بات کو حاکم نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ ان
باتوں سے کوئی ایسی غلط فہمی پیدا ہو جائے جس سے نقصان ہو، کوئی شخص
تمہارے پاس آ کر کسی کے متعلق کوئی خبر دے، یا کوئی واقعہ سنائے، یہ
بتائے کہ فلاں شخص آپ کے متعلق اس طرح کہہ رہا تھا، جب کہ بات
بالکل خلاف واقعہ ہو، تو بغیر تحقیق کے یہ ممکن ہے کہ انسان اس کی بات
سے متاثر ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے نقصان پہنچ جائے، اور
پھر بعد میں اپنی غلطی پر افسوس ہو، اسی لیے وضاحت کے ساتھ فرما دیا گیا
کہ اگر کوئی گناہ گار آدمی جو صالح انسان نہیں ہے، کھلے طور پر گناہوں
میں مبتلا ہے، جھوٹ بولتا ہے، ہر موقع پر غلط بات کہتا ہے، ذرا بھی احتیاط

نہیں برتا، ایسا آدمی جب تم کو کوئی خبر دے تو تم اس خبر کو نہ مانو، جب تک اس کی تحقیق نہ کر لو، تب تک اس کی کسی بات پر کوئی اقدامی عمل نہ کرو، تاکہ تحقیق کے بعد تمہیں کسی طرح کی شرمندگی محسوس نہ ہو۔

موجودہ دور کا ایک عام مرض

ہمارے معاشرہ میں اس قبیل کے بے شمار واقعات ہوتے رہتے ہیں، بے احتیاطی کے ساتھ سنائی گئی خبر پر عمل کر لیا جاتا ہے اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی، جب کہ بعد میں اس کا روائی کو واپس نہیں لیا جاسکتا ہے جو ناواقفیت کی بنیاد پر ایک بے گناہ انسان کے ساتھ عمل میں آئی، آج کل لوگوں کا ایسا مزاج بن گیا ہے کہ وہ محض تفریح کے لیے اپنی مجلسوں میں دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں، اور بے خیالی میں اپنے تمام اچھے اعمال دوسرے شخص کو دے دیتے ہیں، دین اسلام میں اسی چیز کو ”غیبت“ کہا گیا ہے، غیبت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیب کو ذکر کیا جائے، غیبت کا مطلب یہ نہیں کہ کسی دوسرے پر الزام لگایا جائے، دوسرے پر الزام لگانے کو ”اتہام“ یعنی تہمت لگانا کہتے ہیں، شریعت میں ان دونوں چیزوں کی سخت ممانعت ہے، آج ہماری سوسائٹی میں غیبت کا مرض بالکل عام ہو گیا ہے، صرف تفریح کی خاطر اکثر لوگ اپنی نیکیاں دوسروں کو دے دیتے ہیں، یہ ایک خدائی نظام ہے کہ جس نے

غیبت کی اس کی نیکیاں لے کر اس کو دے دی جائیں گی جس کی غیبت کی گئی، اگر اس شخص کی نیکیاں تھوڑی ہوں گی تو جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کے گناہوں کو اس پر لا دیا جائے گا، گویا ہم نے جو کام تفریح کے لیے کیا تھا اس کی سنگینی یہ ثابت ہوئی کہ ہماری آخرت برباد ہو گئی، ہم نے جو تھوڑی سی اتفاقی نیکیاں کی تھیں وہ بھی ختم ہو گئیں، اگر غور کیا جائے تو آج ہم سب اپنی نیکیوں کو اس طرح خود اپنے آپ بہا رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم آخرت میں چند اچھے اعمال کرنے کے باوجود بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں گے، ہماری تمام نیکیاں دوسرے کو دی جا چکی ہوں گی۔

قرآن میں اسی قسم کے غیر محتاط لوگوں کی خبر پر یقین کرنے سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا، تحقیق کا حکم دیا گیا، کیونکہ ایسے لوگ بسا اوقات کسی بھی بات میں مزید نمک مرچ لگا کر، بات کو بڑھاوا دے کر پیش کرتے ہیں، بے عیب بات کو عیب دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے انسان جذبات میں آجاتا ہے اور ناواقفیت کی بنیاد پر غلط اقدام کر بیٹھتا ہے، جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور انسان کو بعد میں افسوس ہوتا ہے۔

عدم تحقیق کا نقصان

عربی زبان کی مشہور کتاب ”کلیلہ دمنہ“ میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو بغیر تحقیق کے کسی بھی بات پر فوراً اقدام نہیں

کرنا چاہیے، ورنہ بسا اوقات انسان کو ایسی ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہوتا، قصہ یوں ہے کہ ایک شخص نے اپنے گھر میں نیولا پالا، جو سانپوں کو کھا جاتا تھا، اس کی وجہ سے اس کے گھر میں سانپ نہیں آتے تھے، اور اس کا ایک چھوٹا بچہ سانپوں کے نہ آنے کی وجہ سے گھر میں محفوظ طریقہ پر کھیلتا تھا، ایک دن کی بات ہے کہ وہ شخص باہر کسی کام سے اپنے بچہ کو تہا چھوڑ کر گیا، جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ نیولے کا منہ خون آلود ہے، جس سے اس شخص کو یہ شبہ ہوا کہ اس نے بچہ کو نوچا ہے اور اس کے ساتھ بدتمیزی کی ہے، اسی خیال میں اس نے نیولے کو مار ڈالا، اس کے بعد جب اندر گھر میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک سانپ مرا ہوا پڑا تھا، جس کو اسی نیولے نے مارا تھا، اور اس کا منہ اسی کے خون سے خون آلود تھا، چنانچہ اس شخص کو اپنے اس عمل پر بہت ندامت ہوئی، لیکن ایسی ندامت کا کیا فائدہ جب کہ بغیر تحقیق کے اقدامی کارروائی ہو چکی تھی۔

نوٹ

اس طرح کے واقعات انسانی سماج میں بھی ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اس سے سبق لینے کی ضرورت ہے کہ ہم کسی بھی غلط یا مبہم خبر پر ہرگز کوئی کارروائی نہ کریں، بلکہ خبر کی تحقیق کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں۔

اہل ایمان سے خطاب

﴿وَاعْلَمُوا أَن فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾
(الحجرات: ۷)

(اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، اگر اکثر معاملات میں وہ تمہاری بات مان لیں تو تم خود پریشانی میں پڑ جاؤ گے، لیکن اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو محبوب بنا دیا ہے، اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے، اور تمہارے دل میں کفر اور گناہوں کو مکروہ بنا دیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح راستہ پر ہیں)

اوپر بتایا گیا تھا کہ ہر کسی کی بات پر فوراً یقین نہیں کرنا چاہیے، اس آیت میں اسی بات کو مزید تاکید کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو تم میں سے کوئی شخص بھی آکر کسی کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ سے کچھ بتا دے، کیونکہ تم میں سے کوئی شخص ایسا عمل اگر تفریح کے لیے بھی کرے گا اور اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں اس شخص کے خلاف شکایت پیدا ہوگی تو اس کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ اس

بات کا دھیان رکھو کہ تم میں یہ عام انسان نہیں ہیں بلکہ اللہ کے نبی ہیں، اگر یہ تمہاری اکثر باتوں کو ماننے لگیں گے تو تمہیں کو نقصان پہنچے گا، اگر اللہ کے رسول ﷺ کی کسی کے متعلق رائے خراب ہو جائے تو اس کو نقصان ہی پہنچتا ہے، ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، آپ ﷺ کے گھر مسجد سے ملے ہوئے تھے، آپ کی اہلیہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے رات کے اندھیرے میں کچھ بات کر رہی تھیں، مسجد کھلی ہوئی تھی، اچانک دور سے ایک صحابی کا گذر ہوا، آپ ﷺ نے زور سے ان کو کہہ کر بتایا کہ یہ ہماری اہلیہ ہیں، حالانکہ آپ ﷺ کے متعلق کوئی شخص بھی غلط شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ کسی غیر خاتون کے ساتھ آپ اندھیرے میں بات کریں گے، لیکن انسان انسان ہے، اس کے ذہن میں کچھ بھی آجائے، اس لیے آپ ﷺ نے ان سے وضاحت کر دی، اگر خدا نخواستہ ان کے ذہن میں کوئی غلط بات آجاتی تو ان کے ایمان کو خطرہ لاحق ہو جاتا، اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق کسی قسم کا غلط خیال آنا ہی ایمان کے لیے خطرناک ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ اور حضرت علیؓ مسجد سے نکلے، ایک شخص کو سوتا دیکھ کر حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس کو نماز کے لیے جگا دو، حضرت علیؓ نے جگا دیا، بعد میں حضرت علیؓ نے معلوم کیا کہ

اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ تو نیک کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں، آپ نے خود یہ کام کیوں نہیں کیا؟ فرمایا: اگر وہ اپنی نیند میں بے خیالی سے بھی میرے اٹھانے پر نماز کے لیے نہ اٹھتا تو یہ چیز کفر ہو جاتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی بات کا بے خیالی سے بھی انکار کرنا ہرگز مناسب نہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ چیز اس قدر ناپسندیدہ ہے تو پھر کسی کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں غلط خیال قائم ہونا کس قدر سخت ہے، اگر کسی کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ کے دل میں غلط خیال قائم ہو جائے تو اس شخص کی آخرت برباد ہو سکتی ہے، اس لیے فرمایا کہ دیکھو تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام آتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی اہمیت ہے، اگر یہ تمہاری بات کو اکثر معاملات میں مان لیں تو خود تمہیں لوگوں کو پریشانی ہوگی، اس کے بعد اہل ایمان یعنی صحابہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل فرمایا کہ تمہاری ایسی اصلاح کر دی ہے کہ تم مکمل ایمان کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے ہو، تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے، یعنی تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت جاگزیں ہو چکی ہے، تمہاری ایسی تربیت ہو چکی ہے کہ تم کوئی بات بھی ایمان کے خلاف نہیں کرتے، یہ محض اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کو

اس طرح مزین کر دیا ہے کہ تم ہر چیز میں ایمان کے تقاضہ کو دیکھتے ہو، اللہ ورسول کا کیا تقاضہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہو، چنانچہ تمہیں وہی پسند آتا ہے جو ایمان کا تقاضہ ہو، ایسا نہیں ہے کہ تمہاری خواہشات تمہارے سامنے ہوں، بلکہ تمہاری خواہشات مغلوب ہو جاتی ہیں اور تم ہر حال میں ایمانی تقاضوں ہی کو پیش نظر رکھتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں کفر اور گناہ کی باتوں سے نفرت پیدا کر دی ہے، ان چیزوں کو تمہارے لیے ایسا مکروہ بنا دیا ہے کہ یہ ساری خراب چیزیں تمہارے دل پسند ہی نہیں کرتے، گویا تمہارے ایمان کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ تم کو ایمان کے خلاف کوئی بھی بات اچھی ہی نہیں لگتی، اسی لیے ان لوگوں کے متعلق اخیر آیت میں فرمایا گیا کہ بلاشبہ یہی لوگ صحیح راستہ پر گامزن ہیں، یعنی اخلاق اور سیرت و کردار کے لحاظ سے صحیح راستہ پر ہیں۔

اس سورہ میں انسانوں کو ہر سطح سے معاملات کے درست کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، بنیادی طور پر یہ بتایا گیا کہ دینی لحاظ سے اور اللہ تعالیٰ کے تعلق کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا لحاظ رکھنا، اسی طرح اس کے رسول کا لحاظ رکھنا سب سے ضروری ہے، ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کرنا درست نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے اور معتمد علیہ ہیں، ان پر کلام الہی کا نزول ہوتا ہے، لہذا ان کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آؤ، ایسا نہ ہو کہ ان کے

اچھے اخلاق دیکھ کر تم ان کے ساتھ عام معاملہ کرنے لگو، آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ جہاں مجلس میں جگہ ہوتی وہیں بیٹھ جاتے، یہ آپ ﷺ کا اخلاق تھا، البتہ ہر مسلمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ محتاط رہے، کیونکہ جب بڑا سمجھ لیا جائے گا تو کوئی شخص آپ ﷺ سے کسی بھی طرح کی بحث یا جھگڑا نہیں کرے گا، آپ کی باتوں میں نکتے نہیں نکالے گا۔

صحابہ کرام کی رائے پر عمل

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ عرب کا مزاج یہ تھا کہ وہ ہر چیز میں اپنے کو دوسرے سے برتر سمجھتے تھے، قرآن مجید میں ان کے اسی مزاج کو آہستہ آہستہ تبدیل کیا گیا، تاکہ اللہ ورسول ﷺ کے احکامات میں وہ اپنی رائے کا دخل نہ دے سکیں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی مراعات میں نبی اپنی رائے پر عمل نہیں کرتا اور اس کا نقصان ہو جاتا ہے۔

جنگ احد اس کی اچھی مثال ہے، غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں میں ان لوگوں کی جو بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، یہ رائے ہوئی کہ کفار سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، کیونکہ ہم آج بدر کے مقابلہ میں زیادہ تعداد میں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کرنا بہتر ہوگا، اس میں آسانی یہ تھی کہ مسلمان اپنے گھروں میں رہیں گے، اور اگر مدینہ سے باہر تین چار کلومیٹر کی دوری پر جا کر مقابلہ کیا جائے تو

وہاں کھلے میدان میں کفار نبی کی طرح ہوں گے، لہذا مدینہ میں رہ کر جنگ کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، لیکن اکثر صحابہ کی تعداد ایسی تھی جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہو سکی تھی، اس لیے کہ جنگ بدر میں نکلتے وقت صرف یہ بات تھی کہ یہ ایک چھوٹی سی مہم ہے، کفار کے ایک چھوٹے قافلہ کو روکنا ہے، جس کے لیے نکلنا آسان ہو وہ چلے، چنانچہ جن حضرات کو کوئی مشغولیت تھی وہ نہیں گئے اور تین سو تیرہ افراد پر مشتمل جماعت کے ساتھ حضور ﷺ اس قافلہ کو روکنے کے لیے گئے، چونکہ کفار بھاری تعداد میں تھے اور اہل ایمان کم تعداد میں تھے، لیکن وہ ان سخت حالات میں پوری طرح اپنے پیر جمائے رکھے، جس پر اللہ کی مدد نازل ہوئی اور فتح نصیب ہوئی، نیز جو لوگ بدر میں شریک تھے ان تمام کی مغفرت کا پروانہ بھی سنا دیا گیا، اس لیے وہ افراد جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، جنگ احد میں مدینہ سے باہر نکل کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے، جنگ میں شریک ہونے پر جن عظمتوں کا انسان مستحق ہوتا ہے ان کے حصول کی خاطر ان کا یہ اصرار ہوا کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں، لہذا اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کے ان جذبات کو دیکھتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر ہی جنگ لڑنے کا ارادہ فرمایا، اور اندر گھر میں جنگی تیاری کے لیے تشریف لے گئے، اس درمیان بعض صحابہ نے ان لوگوں سے جو

باہر نکل کر لڑنے کے قائل تھے یہ کہا کہ تمہاری یہ بات اچھی نہیں ہے، جب اللہ کے رسول ﷺ کی رائے مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کی تھی، تو تمہیں ایسی زبردستی کرنا مناسب نہ تھی، چنانچہ جب آپ ﷺ گھر سے تیار ہو کر تشریف لائے، تو ان حضرات نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم آپ کی رائے پر راضی ہیں، اگر آپ چاہیں تو ہمیں رہ کر لڑیں، اور چاہیں تو باہر نکل کر لڑیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب نبی کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اس کو نہیں بدلتا، اب جنگ مدینہ سے باہر نکل کر ہی ہوگی۔

جنگ احد میں ظاہری طور پر مسلمانوں کی شکست کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہل ایمان اپنی تعداد کو دیکھ کر جذبات میں آگئے تھے، جب کہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک مومن ہمہ وقت یہ یقین رکھے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا اصل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، وسائل و ذرائع انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں، ان کو اصل نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ ان وسائل و ذرائع کے ساتھ انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر کھل یقین رکھنا ہوگا، یہی مطلوب بھی ہے، ورنہ اگر صرف اللہ تعالیٰ کو وسائل و ذرائع کے استعمال کے بغیر مسلمانوں کو جتنا تھا تو جنگ لڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، بلکہ آسمان سے کوئی ایسی چیز اتر سکتی تھی جس سے کفار کی کھلی شکست ہو جاتی اور مسلمانوں کو لڑنا نہیں پڑتا، نہ ہی بڑے بڑے انتظامات کی ضرورت

ہوتی، لیکن جنگوں میں مسلمانوں کی رعایت نہیں ہوئی، بلکہ اسی طرح لڑنے کا حکم دیا گیا جس طرح کفار میدان میں تھے، اور فرمایا گیا کہ تم اللہ کی دی ہوئی صلاحیت و طاقت اور ہمت کا استعمال کرو، اس کی ذات پر یقین رکھو، چونکہ مسلمانوں کو جنگ بدر کے نتیجے میں اپنی تعداد پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا، یہ یقین کر لیا تھا کہ ہماری جیت طے ہے، جب ہم بدر میں ایک تہائی تھے اور کفار کی پوری فوج پر قابو پا گئے تھے تو آج تو بدرچہ اولیٰ ہم فتح یاب ہوں گے، اس لیے دو باتیں ہونیں، ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ ہم کامیاب ہوں گے، غازی و مجاہد کہلائیں گے، دوسرے یہ کہ حضور ﷺ کی بات نہ ماننے کے نتیجے میں پشیمانی اٹھانی پڑی، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ تم اپنی بات نبی کی بات پر بڑھا کر پیش نہ کرو، اپنی ہر بات ان سے منوانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ تمہیں لوگ پریشانی میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ نبی جو بھی بولتا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بولتا بلکہ اللہ کی طرف سے وحی یا اشارہ کے بعد ہی بولتا ہے، گویا نبی کی بولی ہوئی بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی اور سکھائی ہوئی ہوتی ہے، اسی لیے نبی کے متعلق قرآن مجید میں گفتگو کے آداب کو تفصیل سے بیان کیا گیا، ان تعلیمات کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کا حضور ﷺ کے ساتھ نہایت ادب والا معاملہ تھا، حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ جب بھی بات کرتے تو بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ کرتے، یہی حال تمام صحابہ کرام کا تھا کہ وہ بات کرنے میں بہت احتیاط برتتے تاکہ کسی بھی درجہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے، چنانچہ ان حضرات کی تعریف بھی ان الفاظ میں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کا امتحان لیا تو وہ تقویٰ کے مطابق نکلے، لہذا ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

منعم حقیقی

﴿فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

(الحجرات: ۸)

(یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر فضل اور نعمت ہے اور اللہ

تعالیٰ خوب جانتا ہے اور خوب حکمت والا ہے)

صحابہ کرام کے ایمان کی تعریف کے بعد اس آیت میں یہ وضاحت

کر دی گئی کہ ان کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ ان کو ایمان

کے علاوہ تمام باتوں سے نفرت ہے، ورنہ انہیں میں سے بعض لوگ ایسے

ہیں جن کو ایمان کے منافی اعمال سے دلچسپی ہے، اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو

حضرت ابوبکرؓ ابوبکر نہ ہوتے، ابولہب ابولہب نہ ہوتا، وہ چچا تھا لیکن جہنم کا

کنندہ بننا ہے، ابوبکرؓ آپ کے صرف ایک ساتھی اور ملاقاتی تھے، لیکن اللہ

تعالیٰ نے ان کو اپنالیا، گویا یہ سب اللہ کے فضل اور اس کے احسان سے ہے، اس میں کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ہم ایسے ہیں، کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اللہ نے یہ نعمت دی تو حاصل ہوگئی، خود کوئی کہیں سے نہیں لایا، اس لیے کسی کو گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم میں یہ خوبی ہے، یہ اچھائی ہے، یہ نیکی ہے، کیونکہ تمام خوبیاں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور خدا خواستہ اگر اللہ ناخوش ہو جائے تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ یہ تمام نعمتیں چھین لے، اور ایسا ہوتا بھی رہا ہے کہ بڑے بڑے دین دار اور متقی حضرات سے اللہ نے سب کچھ چھین لیا اور وہ یوں ہی چلے گئے، معلوم ہوا کسی کو اپنے آپ پر ناز نہیں ہونا چاہیے، بس ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ ہم کو جو بھی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ ہماری کوشش سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، اس کا کرم ہوتا ہے کہ ہمیں بلا استحقاق عطا فرماتا ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی نعمت کو کہتا ہے کہ یہ ہماری محنت کا نتیجہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ بات ناپسند ہوتی ہے، جس کی بنا پر اس سے تمام نعمتیں چھین لی جاتی ہیں، گویا ہر شخص کے ذہن میں یہ بات رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو کچھ عطا فرمایا ہے یہ بلا استحقاق ہے، سب اسی کا فضل ہے، اس میں ہماری کوشش کا کوئی دخل نہیں، کوشش کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہو بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے، گویا کوشش کو اللہ تعالیٰ نے منحصر

ایک ذریعہ بنایا ہے، غرض کہ فرمایا گیا کہ اہل ایمان میں جو خوبیاں موجود ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور خوب حکمت والا ہے، وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ کس پر انعام کیا جائے، کس پر کرم کیا جائے، کس کے ساتھ رعایت کی جائے، کس کو عطا کیا جائے، جو شخص اس کے فضل کا مستحق نہیں اس پر اللہ کا فضل نہیں ہوتا اور جو اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کو پسند آجائے اس پر اللہ کا فضل ہوتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و علم سے کرتا ہے۔

صلح و انصاف کی تعلیم

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاصِلِحُوا بَيْنَهُمَا
فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي
حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَاصِلِحُوا بَيْنَهُمَا
بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ ☆ إِنَّمَا
الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَاصِلِحُوا بَيْنَ أَخْوَابِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (الحجرات: ۹-۱۰)

(اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑنے لگیں تو دونوں فریق کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر اس کے بعد بھی ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے

جنگ کرو، یہاں تک کہ اللہ کی طرف وہ واپس آجائے، اگر وہ اپنی رائے سے ہٹ جاتا ہے تو ان میں صلح کرادو، اور انصاف سے کام لو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، بے شک تمام مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کو قائم رکھو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو)

اللہ کے رسول ﷺ سے اچھا تعلق ہونے کے بعد دوسری اہم چیز یہ ہے کہ تمام اہل ایمان کے تعلقات آپس میں بھائیوں جیسے ہوں، دین اسلام میں تمام مؤمنین کو بھائی بھائی بتایا گیا ہے، یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپس میں محبت و تعلق کا معاملہ ہو، بھائی کا یہی مطلب ہے کہ بھائی بھائی سے محبت کے ساتھ پیش آئے، دونوں بھائی ایک دوسرے کی رعایت کریں، اختلافات اور جھگڑوں سے دور رہیں، ایک بات پر متفق ہو جائیں، اگر کسی کی رعایت میں کسی کو اپنی رائے سے اترنا پڑے تو اتر جائے، کیونکہ اگر اڑا رہے گا تو اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا، اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لیے کسی ایک کو اپنی رائے دہانا ہوگی، آج دنیا میں ہر طرف اختلاف و انتشار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر کوئی اپنی بات پر اڑا ہوا ہے، اسی لیے آپس میں ٹکراؤ ہے، ہر جگہ دو فریق بنے ہوئے ہیں، کوئی

بھی اپنی بات سے ہٹنے کو تیار نہیں، جس کے نتیجہ میں اختلاف ہوتا ہے اور اس کے بعد ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے، پھر جو فریق طاقتور ہوتا ہے وہ طاقت کے زور پر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح دونوں فریق کے دل ایک دوسرے سے بالکل دور ہو جاتے ہیں، اسی لیے سورہ حجرات کی اس آیت میں فرمایا گیا کہ ایمان والوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مصلحت کو دیکھیں، اگر لڑائی کی صورت پیدا ہوتی ہو تو اپنی بات دبانے کی کوشش کریں، اگر بات کچھ بڑھتی ہوئی نظر آئے تو کوشش کریں کہ سمجھا بجا کر دبا دیا جائے ورنہ نوبت انتشار اور لڑائی جھگڑے تک پہنچ جائے گی۔

رائے کی عصبيت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر مدینہ کے منافقین نے الزام لگانے کی کوشش کی تھی، حضور ﷺ کو جب اس بات کا علم ہوا تو مسجد میں تمام لوگوں کو جمع کر کے معلوم کیا کہ مدینہ میں یہ کیا چرچا ہو رہا ہے، ہم اپنے گھر والوں سے بخوبی واقف ہیں، اس کے باوجود ایسے نامناسب چرچے کیوں ہیں؟ ہم ان کو صحیح نہیں سمجھتے، اس پر مدینہ کے دو مشہور اور بڑے قبیلے ”اوس اور خزرج“ میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا: اگر ایسی نامناسب باتیں کرنے والا شخص ہماری شاخ سے تعلق رکھتا ہوگا تو ہم اس کو قتل کر دیں گے، اور اگر ہمارے بھائیوں کی شاخ کا ہو تو ہم ان سے بھی قتل کرنے کی

اجازت مانگیں گے، یہ بات دوسرے قبیلے والوں کو بری لگی اور وہی پرانی بات نے ان پر اثر کیا، جو زمانہ جاہلیت میں وہ بات پر لڑنے لگتے تھے، خاص طور پر زمانہ جاہلیت میں ان دونوں قبیلوں کی جنگیں تو آپس میں بہت ہی مشہور رہی ہیں، چنانچہ دوسری شاخ کے لوگ بھڑک گئے، اور کہا کہ ہمارے آدمی کو آپ کون ہوتے ہیں قتل کرنے والے؟ جو کچھ بھی کرنا ہوگا ہم خود سمجھ لیں گے، جب مجلس میں ماحول گرم ہوا تو آپ ﷺ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مجلس برخواست فرمادی، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپس میں جھگڑے کی بات شروع ہو جائے۔

لڑائی جھگڑے میں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ نیک انسان بھی اپنی رائے کی عصبیت کا شکار ہو جائے، رائے کی عصبیت بہت خطرناک چیز ہے، اس کا قربان کرنا سب سے مشکل کام ہے، اس لیے نبی پاک ﷺ سے فرمایا گیا کہ اگر دو گروہوں میں جھگڑا ہو جائے تو ان میں صلح کی کوشش کرنی چاہیے، اگر نہ مانیں تو پھر فیصلہ لینا چاہیے اور جو رائے کو نہ مانے اس کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے، تاکہ معاشرہ میں اتحاد باقی رہے، کارروائی اس وقت کرنا ہے جب مسلم حکومت ہو، مزادینے کی وہی مکلف ہے، عام لوگ اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکتے، البتہ یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ سمجھا بھجا کر دو فریق کے جھگڑے کو ختم کر دیں، ان کو کسی ایک بات پر راضی کر لیں،

لڑائی جھگڑے سے بچالیں، البتہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے کام نہ لینا چاہیں تو ان کے متعلق فرمایا گیا کہ ان کے لیے اس وقت تک طاقت کا استعمال کرنا ضروری ہے جب تک کہ وہ اس فیصلہ پر متفق نہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو، اس کے بعد اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو ان میں صلح کرو دینی چاہیے، لیکن اس سب میں انصاف کا خاص خیال رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، احتیاط برتنا چاہیے، کارروائی کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی چیز اللہ کے حقوق کے خلاف نہ ہو، اسی لیے فرمایا گیا کہ اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو، رحمت الہی کا نزول اسی پر ہوتا ہے جو اپنی راحت اور اپنی پسند کو اللہ کے لیے قربان کر دے، ہمارے ایمان کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جہاں اللہ کا حکم ہمارے سامنے آجائے وہاں ہم اپنی خواہشات و بائیں۔

اخلاقی برائیاں

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن
يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن
يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا
بِالْأَلْقَابِ بِغَسِّ الإِسْمِ الفُسُوقُ بَعْدَ الإِيمَانِ وَمَن لَّمْ

يُتَّبِعْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۱﴾ (الحجرات: ۱۱)
 (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی بھی ایک دوسرے کا
 تمسخر نہ کرے، اس کا امکان ہے کہ وہ تم سے اچھے ہوں،
 (جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے) اور نہ ہی عورتیں ایک دوسرے
 کا مذاق اڑائیں، اس کا امکان ہے کہ وہ تم سے اچھی
 ہوں) (جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے) اور تم برے انداز سے اپنا
 ذکر نہ کرو، اور آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب سے
 خطاب نہ کرو، ایمان لانے کے بعد یہ گندرا طریقہ ہے، اور جو
 توبہ نہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ بدراہ لوگوں میں شمار ہوگا)

اس آیت میں بعض اہم بیماریوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، انسانی
 سماج میں جس طرح تمام لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، آپس میں
 ایک دوسرے سے قربت رکھتے ہیں، بعض کا خاندانی تعلق بھی ہوتا ہے، تو
 اس میں ایک دوسرے کا احترام و عزت کرنا ضروری ہے، اور آپس میں ایک
 دوسرے پر تبصرہ بازی یا طنز کرنا، ایسے ناموں سے مخاطب کرنا جن سے کسی
 کی بے عزتی محسوس ہوتی ہو اسلامی مزاج کے خلاف بات ہے، اسی لیے
 اس آیت میں وضاحت کے ساتھ اہل ایمان کو ایسے کام کرنے سے روکا
 گیا ہے، کیونکہ بسا اوقات آدمی کسی کے بارے میں تبصرہ کرتا ہے یا کوئی ایسا

جملہ کہتا ہے جس سے اس کو اپنی بے عزتی محسوس ہو، یا کسی شخص کی کوئی بات لے کر ہنسی اڑاتا ہے، تو اس سے سامنے والے انسان کو اپنی توہین محسوس ہوتی ہے، اور مزاق اڑانے والا شخص یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ اس سے بڑا ہے، یہ ساری غلط حرکتیں اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ تم سامنے والے کو کمزور سمجھ رہے ہو، یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ شخص ہمارا کچھ نہیں کر سکتا، ہم جو چاہیں کریں، جس لفظ سے چاہیں خطاب کریں، ہم چاہیں تو اس کو ”اے ٹھگنے آدھی“ کہہ کر پکاریں، چاہیں تو ”اے لہو“ کہہ کر پکاریں، یہ ایک انسانی عادت ہے کہ ہر انسان دوسرے کی خامیاں نکالنے کی فکر میں رہتا ہے، اور اپنے عیوب کی طرف نظر نہیں کرتا، اس لیے فرمایا گیا کہ انسانوں کی یہ سب عادتیں غلط ہیں، اسلام سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، کسی کو کسی کا تمسخر نہیں کرنا چاہیے، یہ سب عادتیں تکبر کی قسم سے ہیں، ممکن ہے کہ تم جس کو برا سمجھ رہے ہو، جس کو معمولی سمجھ رہے ہو اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بلند و بالا ہو، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت و تقویٰ ایسا ہو کہ اگر وہ اللہ کی طرف سے کسی مسئلہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم کو جھوٹا ثابت نہ کرے، بلکہ ویسا ہی کرے جیسا کہ اس نے کہا ہو، حدیث شریف میں فرمایا گیا:

”کم من أشعث أغبر ذي طمرین لا يؤبه له لو

أقسم على الله لأبره“ (۱)

یعنی بسا اوقات ایسا آدمی جس کا لباس بھی ٹھیک نہیں ہوتا، بالکل بے سلیقہ معلوم ہوتا ہے اگر وہ کسی مجلس میں اللہ کی قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم کو ضرور پورا فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا ہم لوگ دنیا میں جس شخص کو کمتر سمجھتے رہے، مزاق اڑاتے رہے، کل قیامت کے دن اس کا نامہ اعمال ہم سے زیادہ باوزن ہوگا۔

ممانعت کی حکمت

عیب جوئی، تبصرہ بازی، غلط القاب سے مخاطب کرنے کی ممانعت کے لیے عورتوں کو بھی الگ سے خطاب کیا گیا، کیونکہ عورتوں میں یہ بیماری زیادہ پائی جاتی ہے، جہاں وہ خالی بیٹھی ہوتی ہیں، وہاں ان کے پاس سوائے تبصرہ بازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، اس لیے ان کے یہاں ان تمام باتوں کے زیادہ امکانات رہتے ہیں، اسی لیے ان کو خاص طور پر ان باتوں سے روکا گیا، اور ان سے بھی یہی کہا گیا کہ ممکن ہے تم جس کا مزاق اڑا رہی ہو، اس کا مرتبہ اللہ کے یہاں تم سے زیادہ ہو، لہذا ایسے تمام القاب و آداب اختیار کرنے سے احتیاط کرو جن سے کسی کی توہین ہوتی ہو، اس کے بعد آیت کے اخیر حصہ میں فرمایا گیا کہ دلوں میں ایمان کے جاگزیں ہو جانے کے بعد یہ سب باتیں کرنا بہت ہی گندی بات اور گندا طریقہ ہے، اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں، یوں بھی یہ تمام باتیں

اپنی جگہ پر بری ہیں، مگر ایمان کے ساتھ ان باتوں کی برائی مزید بڑھ جاتی ہے، پھر یہ چیزیں فسوق میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لیے جو لوگ اللہ کو مانتے ہیں، اس کے حکموں پر چلتے ہیں، ان کو ان چیزوں سے بچنا چاہیے اور کئے ہوئے عمل پر توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ معاشرہ میں ان بیماریوں کے موجود رہنے پر آپس میں انتشار پیدا ہو جائے گا، ہر ایک کا انتقامی مزاج بن جائے گا، جس معمولی اور کمزور شخص کا تم مزاق اڑاؤ گے یا اس کو غلط القاب سے پکارو گے، اگر وہ آگے چل کر کسی منصب پر فائز ہو گیا تو اس کے اندر تمہارے خلاف ایک انتقامی جذبہ پیدا ہوگا اور تمہاری زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

عہد عباسی کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک صاحب کی ناک کچھ بڑی تھی، تو بہت سے لوگ ان کا مزاق اڑاتے تھے، اور جب ان کو سلام کرتے تو کہتے ”السلام علیکم“ یعنی تم دونوں کو سلام ہو، تمہاری ناک کو اور تم کو، یہ طنز ایسا ہوتا تھا کہ سامنے والا شخص کچھ کہہ بھی نہ سکے، کیونکہ اگر وہ کچھ کہے گا کہ تم نے کن دو کو سلام کیا؟ تو یہ بہانہ بنا دیں گے کہ ہم نے تمہاری ناک کی برائی نہیں کی، بلکہ فلاں شخص آ رہا تھا اس کو سلام کیا تھا، اتفاق کی بات کہ ان صاحب کو حکومت میں کوئی منصب نصیب ہو گیا اور ایک موقع پر ان سب چڑھانے والوں کو انہوں نے قتل کرادیا،

یہ تو ان کاموں کا دنیوی نقصان ہے جو بسا اوقات ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کا اخروی اعتبار سے بھی بہت نقصان ہے، اللہ کے یہاں ان باتوں کی سخت گرفت ہوگی۔

موجودہ دور کا المیہ

موجودہ دور میں ان تعلیمات کی روشنی میں ہم سب کو غور کرنا چاہیے کہ ہم ایمان والے ہونے کے ساتھ اسلامی معاشرت کے ان تقاضوں کو کتنا ملحوظ رکھتے ہیں، آج ہم ایمان والے ہونے کے باوجود کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، بسا اوقات سگے بھائی کو بھائی نہیں سمجھتے، چہ جائیکہ ایمانی بھائی کو بھائی سمجھا جائے، آج ہم صرف اپنا مفاد تلاش کرتے ہیں، جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے بھائی کی عزت میں اپنی عزت سمجھتے، اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے، اس کی راحت کو اپنی راحت سمجھتے، مگر افسوس کی بات ہے کہ آج ہر کوئی اپنی عظمت کے تحفظ کی فکر میں ہے، اگر ذرا بھی کسی کی کوئی بات بری لگ گئی تو فوراً ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، آج ہر ایک کو صرف اپنی عظمت کا احساس ہے، غنودہ گزر کا مزاج ختم ہوتا جا رہا ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمارے اندر رعایت کرنے کا مزاج ہوتا، اپنی بات کو واپس لینے کا مزاج ہوتا، آپسی رنجشوں سے بچنے کا مزاج ہوتا، بھائی کے ساتھ بھائی کی طرح رعایت کرنے کا مزاج ہوتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس میں

اچھے تعلقات قائم کئے جائیں، اختلافات سے، غلط القاب اور تمسخر سے بچا جائے اور معاشرہ میں اتحاد و اتفاق کی فضا بنائی جائے۔

تین مہلک بیماریاں

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ﴾

(الحجرات: ۱۲)

(اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ بن جاتے ہیں، اور تجسس سے کام نہ لو اور ایک دوسرے کی غیبت مت کرو، کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ، تمہیں اس سے کراہت ہوگی اور اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول کرنے والے اور بڑے رحیم ہیں)

اس آیت میں گمان کرنے، کسی کی ٹوہ میں لگنے، کسی کی غیبت کرنے سے روکا گیا ہے، یہ وہ مہلک بیماریاں ہیں جن سے انسانی سماج میں انتشار و تفرقہ ہوتا ہے، دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے، فرمایا گیا کہ

بدگمانی سے بچو، آج کل یہ مرض بہت عام ہے، آدمی بغیر کسی جھجک کے فوراً کسی پر بھی تبصرہ کر دیتا ہے، ”یہ کام فلاں نے اس لیے کیا ہوگا“ ”یہ بات اس لیے ہوئی ہوگی“ وغیرہ وغیرہ، ہر کسی کے متعلق برا مفہوم نکالنے کی عادت پڑ گئی ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ زیادہ برا گمان کرنے سے بچو، کیونکہ بار بار گمان کرنے میں تم سے غلطی ہوگی، جس کی بنیاد پر خراب نتائج نکلیں گے، مثلاً: کوئی شخص تم سے کوئی اچھی بات کہے اور تم اس کو بغیر کسی سبب کے طنز پر محمول کرنے لگو، اور اپنے اس خیال کو تقویت دینے لگو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ان سے دوری اختیار کرنے لگو گے، یہ سوچو گے کہ انہوں نے ایسا اس لیے کہا کہ وہ ہمارا برا سوچتے ہیں، اور اس طرح بغیر کسی بنیاد کے اپنے ایمانی بھائی سے دل میں نفرت پیدا کر لو گے۔

علم حقیقت کے جاننے کو کہا جاتا ہے اور گمان کا تعلق صرف انسانی خیال اور اندازہ سے ہوتا ہے، آگ کے متعلق ہمیں علم ہے کہ وہ جلاتی ہے، اگر ہم کو مارا جائے اور یہ کہا جائے کہ آگ نہیں جلاتی تب بھی ہم اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ آگ نہیں جلاتی، کیونکہ ہمیں اس کے متعلق اچھی طرح علم ہے، لیکن اگر کوئی شخص ہمارے سامنے سے گھوم کر جا رہا ہے تو ہمیں اس کا یقینی علم نہیں ہے کہ وہ اس طرح کیوں جا رہا ہے، لہذا ایسے شخص کے متعلق انسان یقینی رائے قائم نہیں کر سکتا، بلکہ محض اپنے

اندازہ سے اس کے متعلق سوچتا رہے گا اور ذہن میں مختلف قسم کے خیالات لائے گا، کبھی یہ سوچے گا کہ اس کو ادھر کوئی کام رہا ہوگا اس لیے گھوم کر گیا ہے، کبھی یہ سوچے گا کہ اس کو ہم سے کوئی چڑھ ہے اس لیے گھوم کر گیا ہے، اسی چیز کو ”ظن“ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے دیکھنے سے یہ قیاس کر لے کہ فلاں شخص نے ایسا اس لیے کیا ہوگا، اور بسا اوقات یہی چیز آدمی کو بہت نقصان پہنچاتی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تھا کہ ایک شخص نے محض گمان کی بنیاد پر اپنے نیولے کو مار ڈالا اور بعد میں اس کو افسوس ہوا، شریعت اسلامیہ میں ان چیزوں پر خاص توجہ دلائی گئی ہے، یہاں تک فرمایا گیا:

”كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع“ (۱)

یعنی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات نقل کر دے، اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو ہر بات کسی کے سامنے نقل نہیں کرنا چاہیے، ممکن ہے نقل کرنے میں غلطی ہو جائے اور جس کے سامنے بات نقل کی جائے اس کے ذہن میں دوسرے کے متعلق ایک خلش پیدا ہو جائے اور بات بدگمانی تک پہنچ جائے، جب کہ ان صاحب نے محض تفریح اور لطف لینے کے لیے اس کو نقل کر دیا ہو، اس لیے اس طرح کی باتیں کرنے سے منع کیا گیا، کیونکہ ایسی باتیں نہ کہنے

میں کوئی خطرہ نہیں، اور کہہ دینے میں خطرہ ہی خطرہ ہے، محفوظ طریقہ یہی ہے کہ جب تک کسی بات کے متعلق یقینی علم نہ ہو جائے اس کا چرچا نہ کیا جائے محتاط بیانی سے کام لیا جائے۔

تجسس

اس کے بعد اسی آیت میں فرمایا گیا کہ تجسس سے بھی کام نہ لو، یعنی لوگوں کی غلطیاں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرو، آدمی کو یہ بھی شوق ہوتا ہے کہ اگر کسی کے عیب معلوم ہونے کا امکان بھی ہو تو اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، ایک دوسرے سے کہنے لگتے ہیں کہ فلاں نے ایسی حرکت کی، فلاں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، حالانکہ اگر فلاں نے حرکت کی بھی ہو تو تم کو اس سے کیا تعلق؟ وہ خود اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے عمل کا جواب دہ ہوگا، آپ کو کسی کے اندر نکتے نکالنے یا کسی کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، دوسروں کی غلطیاں تلاش کرنا، ان کی کمزوریاں ڈھونڈنا ایمان کے منافی باتیں ہیں، کسی کی غلطی پر نشاندہی کرنے کے آپ اس وقت مکلف ہیں جب آپ مسلمانوں کے حاکم ہوں، وہ اس لیے کہ حاکم کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، البتہ اس کے علاوہ کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی کی برائی کا چرچا کرے، کسی کے عیوب معلوم کرے، کیونکہ عیوب کا معلوم کرنا گناہ ہے، اور عیوب کے معلوم ہونے کے بعد ان کا چرچا کرنا مزید گناہ ہے جس کو

غیبت کہتے ہیں، گویا یہ تجسس لوگوں کو بری راہ کی طرف لے جانے والا عمل ہے، اس سے ہم میں سے ہر ایک کو بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

غیبت

اس آیت میں تجسس کی ممانعت کے بعد اس چیز سے روکا گیا ہے، جو اس کے بعد کا مرحلہ ہے اور آج کل ہم سب اس میں مبتلا ہیں، فرمایا گیا کہ ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو، غیبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے عیب کا تذکرہ کیا جائے، یہ گناہ کی بات ہے اور اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے، جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قیامت کے دن جس شخص کی غیبت کی گئی ہوگی اس کے نامہ اعمال میں غیبت کرنے والے کے نامہ اعمال سے نیکیوں کا اضافہ کر دیا جائے گا، اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس شخص کے گناہ اس پر لا دیئے جائیں گے، بلاشبہ یہ بہت ہی بڑا نقصان ہے، جس کی طرف ہمیں ذرا بھی خیال نہیں ہوتا، ہم محض تفریح اور لطف اندوزی کے لیے دوسروں پر کھل کر تبصرہ کرتے ہیں، اور مفت میں اپنی نیکیاں دوسروں کو دے دیتے ہیں، اس لیے بہت ڈرنے کی بات ہے کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ کل قیامت میں ہماری یہی تفریح ہمارے لیے وبال جان ثابت ہو۔

غیبت کی قرآنی مثال

مذکورہ بالا آیت میں غیبت کی مثال مردہ بھائی کے گوشت کھانے

سے دی گئی ہے، دنیا میں ہم جو اعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس نظام کو دور رخ کا رکھا ہے، جیسے سکہ کے دور رخ ہوتے ہیں، اس میں ایک طرف کچھ ہوتا ہے دوسری طرف کچھ ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے ان اعمال کے بھی دور رخ ہیں، ایک رخ وہ ہے جس کو ہم دیکھ نہیں رہے ہیں اور ایک وہ ہے جس کو دیکھ رہے ہیں، مثلاً: ہم بول رہے ہیں تو ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آواز صرف سامنے ادھر ادھر جا رہی ہے، حالانکہ ایک اور جگہ بھی ہماری آواز محفوظ ہو رہی ہے، اور وہ ہے ہمارے دونوں کندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے جو ہماری ایک ایک چیز کو نوٹ کر رہے ہیں، یہ باطنی نظام ہے جس کا محاسبہ قیامت میں ہوگا، اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ باطنی اعتبار سے سود کے ناجائز و حرام مال کی حیثیت پاخانہ کی ہے، لیکن دنیوی اعتبار سے اس کا جو ظاہری رخ ہے وہ ایک وسیلہ ہے، اس سے آدمی دنیوی فائدے اٹھاتا ہے، دنیوی زندگی میں اس کا باطنی رخ اس لیے ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کے لیے بنایا ہے، لہذا اگر کوئی انسان سود کی رقم کھاتا ہے یا حرام کمائی کا مال استعمال کرتا ہے، اس دنیا میں مزے اڑاتا ہے، تو قیامت میں جب اس کا باطنی رخ سامنے آئے گا تو معلوم ہوگا کہ اس شخص نے کتنا پاخانہ کھایا، کیونکہ وہاں ہمارے ان اعمال کا دوسرا رخ مسلسل عمل میں آ رہا

ہے، اچھے اعمال کا اچھا رخ عمل میں آرہا ہے اور برے اعمال کا برا رخ، غیبت کا بھی یہی معاملہ ہے کہ انسان کو غیبت میں بہت مزا آتا ہے، لیکن قرآن مجید میں غیبت کی مثال اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے دی گئی ہے، یعنی اگر کوئی کسی کی غیبت کر رہا ہے تو وہ ایسا ہے جیسا کہ وہ اپنے بھائی کا مردہ جسم کھا رہا ہے، یہ ایسی گندی بات ہے کہ اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ہم یہ عمل کر رہے ہیں تو اس کو کراہت ہوگی، چونکہ اس کا علم قیامت میں ہوگا، اس لیے لوگوں کو ابھی اندازہ نہیں کہ ہم کس قدر سنگین عمل محض تفریح کے لیے کر رہے ہیں، نہ جانے قیامت میں کس مقدار میں یہ نظر آئے گا کہ ہم نے اپنے مردہ بھائی کے گوشت کو کتنا کھایا، چنانچہ اس کی وہی سزا آخرت میں دی جائے گی جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا، اور غیبت کرنے والے کا نامہ اعمال بالکل خالی ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ بسا اوقات بعض واقعات کے ذریعہ سے بھی یہ دکھا دیتا ہے کہ جو چیز ظاہر میں خوبصورت، اچھی اور مزے دار ہے وہ باطن میں خراب ہے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم ایک جگہ دعوت میں گئے، جہاں کھانے کے بعد شاہی ٹکڑے بھی تھے، اللہ کا فضل ہوا کہ ہم نے وہ شاہی ٹکڑے نہیں کھائے، البتہ دعوت میں شریک ہونے والے دیگر افراد نے بہت شوق سے کھائے، بعد میں معلوم ہوا کہ ان شاہی ٹکڑوں میں کوئی

خرابی تھی، جس کی وجہ سے جن جن لوگوں نے شاہی ٹکڑے کھائے تھے سب کی طبیعت خراب ہو گئی، تو ظاہر میں وہ ٹکڑے بہت اچھے لگ رہے تھے، مگر اندرونی اعتبار سے ان کا کیا نقصان تھا وہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا، اسی طرح ظاہری اعتبار سے ہم جو غیبت کرتے ہیں اس میں لطف آتا ہے، لیکن باطنی اعتبار سے یہ کس قدر وبال جان عمل ہے، ابھی ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہے، نبی پاک ﷺ کو بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ اعمال کی حقیقت دکھا دیتا تھا اس لیے ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص جنہوں نے بہت غیبت کی تھی، ان سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اپنا منہ صاف کر کے آؤ، تمہارے منہ میں گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔

عمل کی بنیاد

ہر بری چیز سے بچنے اور ہر اچھے عمل کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرنے والا بن جائے، اسی لیے اس آیت کے اخیر میں فرمایا گیا کہ اللہ سے ڈرو، یعنی اللہ کے محاسبہ سے ڈرو، ایسا عمل کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ قیامت میں سخت حساب لے گا، لہذا تم میں ہر ایک کو احتیاط کرنی چاہیے، ڈرنا چاہیے، تاکہ تمہارا محاسبہ اچھا ہو، اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والے اور بڑے رحیم ہیں۔

قرآن کی تعلیم مساوات

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ
وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ
اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (الحجرات: ۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو جماعتوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں احتیاط کی زندگی گزارتا ہو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے)

گذشتہ آیات میں ایمان والوں کو ایمانی تہذیب کی تلقین کی گئی تھی، یہ بتایا گیا تھا کہ اسلام اور ایمان صرف عبادت کا نام نہیں بلکہ زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا نام ہیں، ایمان لانے کے بعد ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی بن جاتا ہے، اس طرح تمام ایمان والے ایک خاندان کی طرح ہو جاتے ہیں، جس کو ایمانی خاندان کہا جاسکتا ہے، یہ ایمانی خاندان نسلی خاندانوں پر فوقیت رکھتا ہے، کیونکہ اس خاندان سے تعلق رکھنے والوں میں لڑائی جھگڑے کا کوئی گزر نہیں ہوتا، جب کہ نسلی خاندان اور قبائل اس سے محفوظ نہیں، ان کے درمیان کبھی قبائلی بنیاد پر،

کبھی نسلی بنیاد پر، کبھی زبان کی بنیاد، کبھی حسب کی بنیاد پر الگ الگ جتنے بن جاتے ہیں، آپسی کشمکش اور لڑائیاں ہوتی ہیں، زیادتیاں ہوتی ہیں، ان میں طاقتور کمزور کو دباتا ہے، زیادہ وسائل والا کم وسائل والے کا حق مارتا ہے، اور اس بگاڑ کا سبب یہی ہوتا ہے کہ لوگ اپنے الگ الگ ٹکڑے بنا کر ایک دوسرے سے عصبیت برتتے ہیں، گورا کالے کو کمتر سمجھتا ہے، عہدہ والا بغیر عہدہ والے کو کمتر سمجھتا ہے، جس خاندان میں بڑی شخصیات ہوئی ہوں وہ کم شخصیات والوں پر اپنے کو برتر سمجھتا ہے۔

سورہ حجرات کی اس آیت میں انہیں باتوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تمام انسان ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہیں، ان میں کسی کو کسی پر تفوق حاصل نہیں ہے، لوگوں نے تفوق کی جو شکلیں بنالی ہیں یہ بالکل غلط ہیں، معاشرہ سے ان معیارات کو مٹانا چاہیے، ہمارے ایمان کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے دور رہیں جو آپس میں اختلاف اور ٹکراؤ کا سبب بنتی ہوں، یہ جیسی ممکن ہے جب ہم ایمان کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ دلوں میں جاگزیں ہوں، اور اس کے بعد حقوق العباد کی ادائیگی سے متعلق جو احکامات ہیں وہ بھی ہمارے پیش نظر ہوں، کسی کی غیبت، عیب جوئی، تبصرہ بازی سے ہم دور ہوں، ہم ہر وقت اپنی فکر کریں، اپنی عاقبت اچھی بنانے کی کوشش کریں،

دوسروں کے عیوب تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیوب تلاش کریں، یہ یقین رکھیں کہ اگر اس دنیا میں ہم اچھے اعمال کرنے کے باوجود آپس میں لڑائی جھگڑا، غیبت وغیرہ نہیں چھوڑیں گے تو کل قیامت میں ہمیں ان تمام چیزوں کا حساب اپنی نیکیاں دے کر ادا کرنا ہوگا اور ہم تمام تر اچھے اعمال کے باوجود خالی ہاتھ ہو جائیں گے، اسی طرح اپنے آپ کو کسی پر برتر نہ سمجھیں، کیونکہ عام طور پر کسی کی برائی، یا تبصرہ یا اس کو برے نام سے اسی وقت پکارا جاتا ہے جب کوئی شخص دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھ رہا ہو، اسی لیے قرآن مجید میں تفوق کی تمام شکلوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے، تمام انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں، سب کو اللہ نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، البتہ تم لوگ جس طرح مختلف خاندانوں اور قبائل میں تقسیم نظر آتے ہو، اس کی مصلحت یہ نہیں ہے کہ تم کو ایک دوسرے پر تفوق دینے کے لیے ایسا کیا گیا یا ایسا تمہاری کسی فضیلت کی بنیاد پر ہوا، بلکہ یہ اس لیے ہوا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، جس طرح ملک صوبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، صوبے شہروں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، شہر محلوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو معلوم کرنے اور نظام کے اندر آسانی ہو، اسی طرح ہر شخص کا کوئی نام رکھا جاتا ہے، تاکہ اس کے

ذریعہ وہ پہچانا جاسکے، ورنہ بغیر نام کے کسی بھی شخص سے بات کرنا مشکل ہو جائے گا، کیونکہ اگر کوئی شخص صرف ”فلاں صاحب، فلاں صاحب“ کہہ کر کسی کو معلوم کرے تو بتانا مشکل ہوگا، لیکن اگر وہ نام بتا دے تو جو لوگ اس کو جانتے ہوں گے وہ فوراً بتا دیں گے کہ اس نام کا شخص کس شہر اور کس محلہ میں رہتا ہے، گویا یہ تقسیم ایک سہولت اور پہچاننے میں آسانی کے لیے کی گئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو جاننے اور ایک دوسرے تک پہنچنے کی آسانی ہو، اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ فلاں شخص فلاں سے بہتر ہے، اور فلاں شخص فلاں سے کمتر ہے، بلکہ یہ تقسیم محض تعارف و رابطہ کے لیے ہے، البتہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں میں سب سے زیادہ عزت و بڑائی والا وہ شخص ہے جو لوگوں میں سب سے زیادہ احتیاط کی زندگی گزارتا ہو، برائیوں سے بچتا ہو، اللہ کے حکموں پر چلنے کی کوشش کرتا ہو، اس کا سچا مطیع و فرمانبردار ہو۔

معلوم ہو کسی کے باعزت ہونے کا پتہ لگانے کے لیے اس کے باپ یا خاندان کی عظمت کا معلوم کرنا ضروری نہیں بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا اللہ سے کیسا تعلق ہے، وہ کس درجہ ہر کام میں احتیاط برتنے والا ہے، کیونکہ جس شخص کا اللہ تعالیٰ سے تعلق زیادہ ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ

طرف سے عزت بھی زیادہ ملی ہوگی، جس کے نتیجے میں ہر جگہ اس کی محبوبیت نظر آئے گی، اور جس شخص کا اللہ تعالیٰ سے تعلق کم ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت بھی کم ملے گی، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت کم ملے گی تو ایسے شخص کو دوسری جگہوں پر بھی کوئی عزت حاصل نہیں ہوگی، بلکہ اگر ایسے شخص کو جو توں کے پاس بھی جگہ مل جاتی ہے تب بھی بڑی عزت کی بات ہے، معلوم ہوا کہ عزت و ذلت کا معیار تقویٰ اور عدم تقویٰ ہے، اعلیٰ خاندان یا زبان سے تعلق رکھنا نہیں۔

آیت کے اخیر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر ایک چیز سے باخبر ہے، یعنی اگر کوئی شخص ان تعلیمات کے باوجود اصل عزت والا کسی ایسے شخص کو سمجھے جو تقویٰ والا نہ ہو، دنیوی اعتبار سے کسی چیز پر تفوق دکھائے، لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھے، اور ظاہر میں کچھ اور دکھانے کی کوشش کرے کہ ہم کسی کو بڑا نہیں سمجھتے، تو ایسا شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ وہ ہمہ وقت تمام لوگوں کے ایک ایک کام سے باخبر ہے اور تمام لوگوں کے دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔

مؤمن یا مسلم

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا

أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يُلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْعًا إِنَّ اللَّهَ
عَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿الحجرات: ۱۴﴾

(دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، کہہ دیجئے کہ تم
ایمان نہیں لائے ہو، اور لیکن تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں،
اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے اور اگر
تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہارے
اعمال میں کوئی کمی نہیں فرمائے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف
فرماتا ہے اور رحم والا ہے)

جب بعض لوگوں نے اسلام کا غلبہ ہوتے دیکھا تو وہ اسلام میں
داخل ہو گئے اور ان کا شمار مسلمانوں میں ہونے لگا، لیکن ابھی ان کا وہ
درجہ نہ ہوا تھا جو ایمان والوں کا ہوتا ہے، کیونکہ وہ اسی وقت ہوگا جب ان
کے دلوں میں ایمان پیدا ہو جائے، اور ان کے دل ایمان والے بن
جائیں، ورنہ بغیر اس کے وہ لوگ مسلم کہلائیں گے، البتہ مومن ہونے
کے لیے دین اسلام کی تعلیمات کو پوری زندگی میں اتارنا ضروری ہوگا،
چنانچہ بعض دیہات کے لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے یہ بتایا
کہ ہم ایمان والے ہو گئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ

اس وقت پوری طرح ان پر مومن کہنا منطبق نہیں ہوتا، کیونکہ ابھی ایمان ان کے دلوں میں مکمل طور پر جاگزیں نہیں ہوا ہے، اس وقت وہ صرف یہ کہیں کہ ہم اسلام لائے ہیں، اسلامی کلمہ پڑھ لیا ہے، البتہ کامل درجہ کے مومن تو اسی وقت بنیں گے جب ایمان ان کے دلوں میں اتر جائے گا، اور اس کے لیے یہ شرط ہے کہ انسان اللہ و رسول کی اطاعت کرے، انہوں نے جو رہنمائیاں کی ہیں ان کی روشنی میں اپنی زندگی گزارے، گویا ایک شخص کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس کے دل میں ایمان ہو اور ایمان کے ساتھ اطاعت خدا و رسول ہو، جب یہ دونوں چیزیں موجود ہوں گی تبھی انسان گناہوں سے بچ سکے گا، اور جو اعمال بھی کرے گا ان سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا، ورنہ بغیر ان چیزوں کے اچھے اعمال بھی بے فائدہ ہوں گے، اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اسی آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کسی کے اعمال میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں فرمائے گا، تمہارے اعمال جس سطح کے ہوں گے ان کو اسی حساب سے انصاف کے ساتھ دیکھا جائے گا، اور اس کے بعد اسی آیت میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور رحم والا ہے، وہ کسی کے اوپر کوئی چیز زبردستی عائد نہیں کرتا، جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

اہل ایمان کی شان امتیازی

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ
يُرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (الحجرات: ۱۵)

(بلاشبہ ایمان والے لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول کو
دل سے قبول کیا، پھر انہیں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ پیدا نہیں
ہوئے، اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مال کے
ذریعہ جہاد کیا، یہی لوگ ہیں جو سچے لوگ ہیں)

اس آیت میں بتایا گیا کہ اصل ایمان والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اللہ اور رسول کو، ان کی تعلیمات کو دل سے قبول کیا ہے، ان کے دلوں میں
ایمان اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ ان میں شک و شبہ کی کوئی بات پیدا نہیں
ہوتی، اللہ اور اس کے رسول ان کو جو حکم دیتے ہیں وہ بغیر کسی تردد کے اس پر
عمل کرتے ہیں، نہ نفع دیکھتے ہیں نہ ہی نقصان، ہر حکم کو بسر و چشم مانتے
ہیں، خواہ وہ حکم ان کی پسند کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس بات کو آج کے
دور کے تناظر میں دیکھا جائے تو بالکل الٹا نظر آتا ہے، آج لوگوں کا حال یہ
ہے کہ جب ان کے سامنے اسلام کی بات کہی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے
ہیں کہ اس زمانہ میں اس پر عمل کرنا مشکل ہے، اب ایسا نہیں چلے گا،

حالانکہ ایمان والوں کی دائمی صفت یہ بتادی گئی کہ جب ان کے سامنے اللہ ورسول کا حکم آجائے تو وہ چیز زمانہ میں چلے یا نہ چلے، اس کو ہر حال میں ماننا ہی ماننا ہے، خواہ اس میں ہمارا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

سورہ حجرات کی اس آیت میں اہل ایمان کی علامت بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا کہ اصل ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اللہ ورسول پر ایمان لانے کے بعد ان کے ہر حکم کو مانتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں، نیز اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو بھی مختلف طریقوں سے دین کی نصرت اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لگا دیتے ہیں، اس سلسلہ میں انہیں اپنی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، خواہ ان کی جان چلی جائے یا ان کا مال فنا ہو جائے، ایسے لوگوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں، یعنی یہ جو زبان سے کہتے ہیں وہ دل سے بھی کہتے ہیں، ان کا اندر اور باہر کا حال یکساں ہوتا ہے، ان سے جو کہا جائے اسی پر عمل کرتے ہیں۔

اللہ کا علم

﴿قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰۷﴾ يَمُنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (الحجرات: ۱۶-۱۷)

(ان سے کہہ دیجئے کیا تم اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو، اللہ تعالیٰ تو وہ ساری چیزیں جانتا ہے جو آسمان و زمین میں پائی جاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، یہ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے، ان سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے اسلام کا احسان ہم پر نہ جتاؤ، بلکہ اللہ کا تم پر یہ احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی اگر تم سچے ہو)

جن لوگوں نے اپنے اسلام کے متعلق یہ کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے، ان آیات میں انہیں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ کو تمام چیزوں کا علم ہے، آسمان و زمین کی ایک ایک چیز سے وہ بخوبی واقف ہے، باریک سے باریک چیز بھی اس کے علم میں ہے، اسی طرح تم کتنے مسلمان ہو یا تم میں کتنا ایمان ہے یہ اللہ کو معلوم ہے، اس لیے تمہارے دعویٰ کا کوئی فائدہ نہیں، تمہیں دعویٰ کے بجائے اللہ کے رضا کی طلب میں لگ جانا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات بہت سے مصالح کی بنا پر بھی لوگ دعویٰ کرتے ہیں، کبھی مادی منافع کے حصول کے لیے، کبھی جاہ کے لیے، کبھی کسی اور دنیوی فائدے کے لیے۔

خدا کا احسان

آیت میں ان کے احسان جتانے کے متعلق کھل کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ ہمیں اپنے مسلمان ہونے کا احسان جتاتے ہیں، حالانکہ اگر یہ مسلمان ہوئے ہیں تو اس سے انہیں کو فائدہ پہنچے گا، اللہ کو کسی کی عبادت کی غرض نہیں، اس کی عبادت تمام مخلوقات کر رہی ہیں، فرشتے، پرندے حتیٰ کہ جامد چیزیں جیسے درخت و پتھر وغیرہ بھی اس کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں، لہذا اگر کوئی شخص یہ سوچتا ہے کہ وہ اسلام لا کر اس بات کا احسان جتائے کہ اب وہ اللہ کی عبادت کرے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہے، اللہ تعالیٰ کو کسی کی عبادت کی ضرورت نہیں، البتہ اگر تم ایمان لائے ہو اور اللہ کی عبادت کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، اس کے ذریعہ تمہاری ہی اخروی زندگی درست ہو جائے گی، وہاں کامیابی نصیب ہوگی، اس زندگی میں تمہارے لیے راحت کا سامان ہو جائے گا، اس لیے یہ تو خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، یہ توفیق عطا فرمائی کہ تم ایمان کی دعوت قبول کرو، ایمان والوں میں اپنے کو شامل کرو، گویا جو لوگ ایمان لائے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا، اب اگر وہ لوگ اپنے ایمان میں واقعی سچے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کریں اور یہ سمجھیں کہ ایمان کی یہ دولت ہماری محنت سے نہیں بلکہ محض اللہ کے کرم سے ملی ہے۔

علام الغیوب

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ

بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الحجرات: ۱۸)

(اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا ہے ان چیزوں کو جو تم کرتے ہو)

سورہ حجرات میں اہل ایمان کو معاشرتی تعلیمات دی گئیں، اور اس آخری سورت میں ایک جامع بات کہہ دی گئی کہ تم سوسائٹی میں رہ کر جو عمل کرو گے، تم اپنے دلوں میں اچھی یا بری جو بات بھی چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ صرف ان ہی چیزوں سے واقف نہیں ہے بلکہ اس کائنات کی ایک ایک چیز سے بخوبی واقف ہے، وہ ہر وقت ہم سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔

اس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے، اس کے لیے ”غیب“ کا لفظ استعمال کیا گیا، غیب اس کو کہتے ہیں جس سے لوگ ناواقف ہوں، دین اسلام کا انحصار غیب پر ایمان لانے ہی میں ہے، اس لیے کہ ہم سے جو باتیں بتائی گئی ہیں، جن کو مان کر ہم مؤمن و مسلمان ہوئے ہیں وہ غیب ہی کی باتیں ہیں، اور یہی بات اصل ہے، کیونکہ جو چیز مشاہدہ کی ہوتی ہے، اس کے ماننے میں کسی کو انکار نہیں ہوتا، آگ کو آگ ہی مانا جائے گا، پتھر کو پتھر ہی مانا جائے گا، پانی

کو پانی ہی مانا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیزیں اور ان کی تاثیر ہمارے مشاہدہ میں ہے، ہمیں ان کا تجربہ ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فضا میں فرشتے ہیں، ہر انسان کے دونوں کندھوں پر فرشتے ہیں تو یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کے مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں، اب غیب کی ان چیزوں کو ماننے کے لیے ہمیں اسی پر اعتبار کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ ہم کو بتائیں، انہیں باتوں کے دل سے ماننے پر ہمارے ایمان کا انحصار ہے، اگر ہم نے ان باتوں کو نہیں مانا تو ہم اس دین کے دائرہ سے باہر ہو جائیں گے، گویا دین اسلام کا محور غیب کی باتوں پر ایمان لانا رکھا گیا ہے۔

غیب کی باتوں پر یقین

غیب کی باتوں پر ایمان لانے میں کسی بھی انسان کو تردد اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غیب کی باتیں جس کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاتا ہے، اس زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس کی پوری زندگی اچھے اوصاف سے تعبیر ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے مراحل سے گذارا جاتا ہے کہ ان سے گذرنے کے بعد اس کی بات پر کسی کو ذرا بھی تردد نہیں ہونا چاہیے، نبی پاک ﷺ کے متعلق آتا ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے بھی کبھی جھوٹ نہیں بولے، عہد جاہلیت میں بھی لوگ آپ کو ”سچا“ کہہ کر پکارتے تھے، آپ کی امانت و دیانت کے

چرچے تھے، تو جس شخص کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نبوت سے پہلے اس قدر صاف اور سچا ہو تو پھر وہ نبوت کے بعد کوئی غلط بات کیسے کہہ سکتا ہے، جب کہ نبوت کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر مہر لگا دی کہ نبی ﷺ جو بھی بولتے ہیں وہ اپنی مرضی سے نہیں بولتے بلکہ اللہ تعالیٰ کہلواتا ہے، گویا اگر نبی ﷺ نبوت کے بعد لوگوں کو اللہ سے ڈرا رہے ہیں، آخرت کی یاد دلا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں، بلکہ یہ وہی کہہ رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ کہلوا رہا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ایک سچے آدمی کی بتائی ہوئی بات کو نہیں مانتے، جب کہ دنیوی اعتبار سے اگر کوئی شخص اپنا کوئی تجربہ بتائے، کسی بات پر عمل کرنے کی تعلیم دے تو تمام لوگ اس کے تجربہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں، سائنس دانوں کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے میں ذرا بھی تردد نہیں ہوتا، ہم فوراً ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے، وہ جو چیز بتا رہے ہیں ایک تجربہ کے بعد بتا رہے ہیں، گویا ہماری زندگی کا سارا نظام دوسروں کی بات ماننے پر ہی چل رہا ہے، عام زندگی میں بھی جب ہم کسی نئے راستہ پر جاتے ہیں تو پہلے کسی نہ کسی جاننے والے سے

اس راستہ کے متعلق معلوم کرتے ہیں، اور اس کی بات پر اعتبار کرتے ہوئے آگے جاتے ہیں، غرض کہ اگر ہم دوسروں کی بات نہ مانیں تو ہم محدود ہو کر رہ جائیں گے، انسانی معاشرہ اسی وقت بنتا ہے جب اس کے اندر آپس میں ایک دوسرے کا تعاون ہو، لیکن جب تجربہ کی روشنی میں ہمیں نبی کوئی بات بتاتا ہے تو ہم اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جب کہ اس کی پوری زندگی سچائی سے تعبیر ہوتی ہے، ہمیں اس کی بات میں تردد ہوتا ہے، یہ شک ہوتا ہے کہ نہ جانے یہ بات کہاں تک صحیح ہوگی، یہ فکر ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اس پر عمل کرنے میں ایسا نہ ہو کہ نقصان ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری باتیں نبی کی نبوت کو دل سے نہ ماننے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اگر نبی کی نبوت کو دل سے مانا جاتا تو جن چیزوں سے نبی نے سختی سے روکا ہے، ہم ان سے بہت دور ہوتے، لیکن آج دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جن چیزوں سے نبی نے روکا ہے ہم ان چیزوں کے اتنا ہی قریب ہیں، ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہر چیز اللہ کے قبضہ میں ہے، جو کچھ ہوگا وہ اسی کے کرنے سے ہوگا، وہ جس کو چاہے بیمار کر دے، جس کو چاہے اچھا کر دے، جس کے لیے چاہے دوا کو مفید بنا دے، جس کے لیے چاہے دوا کو غیر مفید بنا دے، ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم اطمینان سے ان تمام باتوں کی خلاف ورزی

کرتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کی بتائی ہوئی باتوں پر پورا یقین نہیں کرتے ہیں، اگر ہم صحیح طور پر مانتے ہوتے تو ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے میں ہم اسی طرح ڈرتے جیسا کہ ایک مؤمن کو ڈرنا چاہیے، مگر آج ان تمام احکام کی کھلے طور پر خلاف ورزی کرنے کے ساتھ ہر کوئی خوش نظر آتا ہے، گویا اس کو کوئی خوف ہی نہیں ہے، آخرت کی زندگی کا کوئی احساس ہی نہیں ہے، ہمارے دلوں میں یقین کی وہ کیفیت ہی مفقود ہے، جس کے ہونے پر اگر ہمارے سامنے دوزخ کا اور اس کی ہولناکیوں کا تذکرہ کر دیا جاتا تو ہم پر خاص اثر پڑتا، ہم لرز جاتے کہ مرنے کے بعد ایسا ہونے والا ہے، اس کیفیت کے بعد ہمیں گناہوں سے بچنا بھی آسان ہوتا، آج ان تمام باتوں کا نہ ہونا ہمارے ایمان کے کمزور ہونے کی علامت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہمارا ایمان پوری طرح پکا نہیں ہے، جس کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں ایمان کے اثرات منتقل نہیں ہو رہے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ایمان کی اس دولت کو سمجھے، اللہ تعالیٰ کا احسان مانے، اس کی حقیقت کو اپنے دل میں بٹھائے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے درود کی ٹھوکریں کھانے سے بچالیا، اور حقیقی مالک کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی توفیق عطا فرمائی، ورنہ

بہت سے لوگ ہیں جو دیکھنے میں ہمارے جیسے ہیں، مگر ان کو یہ عظیم دولت نہ مل سکی، اگر ان تمام باتوں کا استحضار ہو تو کوئی بھی شخص بلاشبہ اللہ ورسول کے احکام کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا، نہ ہی اس کی یہ ہمت ہوگی کہ وہ اس کے خلاف دل میں خیال بھی لائے، اس لیے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ اللہ تعالیٰ میری ہر چیز سے بخوبی واقف ہے، خواہ وہ چیز میں اپنے دل میں چھپاؤں یا ظاہر کر دوں، تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، جیسا کہ اوپر کی آیت میں وضاحت کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، اب خواہ وہ چیزیں کائنات کی مخفی چیزوں میں سے ہوں یا ظاہر، ان سب کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے، ہم انسانوں کو صرف ظاہری چیزوں کا یا انہیں چیزوں کا علم ہے جو دوسرے کے تجربوں سے معلوم ہوئی ہیں، لیکن اس وسیع کائنات کے ایک ایک ذرہ سے واقف وہی ایک تنہا ذات ہے جس کے احاطہ علم سے کوئی چیز بھی باہر نہیں۔

تخلیق آدم کا مقصد

اس سورہ میں مسلمانوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں صحیح مسلمان بننے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو یوں ہی تفریحاً یا محض ایک دلچسپی کے لیے نہیں پیدا کیا، بلکہ با مقصد پیدا

کیا، ان کی عظمت فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمائی، اور ان کو یہ بتایا کہ ہم ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جس کو تمام مخلوقات پر امتیاز حاصل ہے، حالانکہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت میں فرشتوں سے زیادہ کس کو امتیاز حاصل ہوگا؟ وہ تو مجسم عبادت ہیں، وہ گناہ سے واقف ہی نہیں ہیں، گناہ کرنا تو دور کی بات ہے، وہ صرف خدا کے ارادوں، اور اسی کی مشیت پر سب کچھ کرتے ہیں، اسی کے تابع ہیں، ان سے زیادہ کون عبادت گزار، اطاعت شعار ہوگا؟ لیکن ان کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اور دوسری مخلوقات پر اس کو برتر بنایا، اور انسان کے لیے پوری دنیا بسائی، دنیا میں جو اس نے نعمتیں رکھیں یہ انسان کے لیے رکھیں، حتیٰ کہ چاند و سورج کی گردش بھی انسان ہی کے لیے ہے، اللہ نے اس کو تسخیر کے لفظ سے بیان فرمایا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے، یہ سب چیزیں تمہارے لیے مسخر کیں، یہ تمام چہند و پرند انسان کی ضرورت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، یوں نہیں ہے کہ ایک مخلوق یہ پیدا کر دی گئی، دوسری یہ کر دی گئی، جہاں بہت ساری مخلوقیں پیدا کی گئیں ان میں ایک انسان بھی پیدا کر دیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو مرکزی حیثیت دی گئی، اور ان ساری مخلوقات کو انسان کے تابع بنایا گیا، تاکہ یہ اس کی ضرورت کو پورا کریں، اور اللہ نے زمین کے اندر

ان سب چیزوں کے خزانے رکھ دیئے جن کی انسان کو ضرورت پڑ سکتی ہے، چنانچہ سائنس داں برابر انکشاف کرتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز نکلی، فلاں طاقت معلوم ہوئی، فلاں سے یہ فائدہ معلوم ہوا، تو وہ اس کو محض معلوم کر لیتے ہیں، لیکن ان چیزوں کو پیدا نہیں کرتے، اسی لیے ان کے یہ انکشافات جیسی ممکن ہیں جب کوئی چیز موجود ہو۔

مشیت الہی

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا یہ نظام ہے کہ انسان کی جو کچھ ضرورت ہو سکتی ہے، اس کی صحت، اس کی بقاء کے لیے اور اس کی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو پہلے ہی اس زمین کے اندر رکھ دیا ہے، کیونکہ ایک انسان کی ضرورت کو اس کے رب سے زیادہ کون جان سکتا ہے، اسی نے سب کو بنایا ہے اور انسان کو بھی بنایا ہے، تو انسان کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے، اس لیے اس نے انسان کی ضرورت کی ہر چیز زمین کے اندر محفوظ کر دی ہے، انسان ان اشیاء سے وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتا رہتا ہے، لیکن غور کی بات یہ ہے کہ یہ سب صرف یوں ہی تفریحاً نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی مخلوق پیدا کرنی تھی جس سے وہ اس دنیا میں کام لے، اس سے وہ فریضہ انجام دلوائے جو صحیح

معیاری زندگی کا فریضہ ہے، جس میں بنیادی بات انسان کا اپنے مالک کو پہچاننا اور اس کا شکر گزار ہونا ہے، اس کی شکرگزاری کا طریقہ اختیار کرنا ہے، اور ایک اچھا صالح انسان بننا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے بہتر سے بہتر انسان بننا ہے، یہ بھی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے انسان کے مزاج میں وہ ساری خصوصیات رکھ دی ہیں جو اس کو بہتر بنانے کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں، اور ان کے ذریعہ سے انسان بہتر سے بہتر انسان بن سکتا ہے، فرشتوں پر بھی فائق ہو سکتا ہے، اس لیے کہ وہ وہ خدمت انجام دیتا ہے جو دوسری مخلوقات نہیں دے سکتیں، کیونکہ زمینی مخلوقات صرف انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہیں، ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں، ان میں سے بعض سواری کے لیے ہیں، بعض گوشت کے لیے ہیں، بعض اون کے لیے ہیں، اور جو بھی ان سے فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کے لیے ہیں، اس کا بھی زیادہ علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

امتیازی وصف

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فرشتوں کے مقابلہ میں جس چیز پر خصوصیت و امتیاز بخشا وہ علم ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا فرمایا، اس کی خصوصیت عطا فرمائی، اور فرشتوں سے بتایا کہ یہ ان کی خصوصیت ہے، یہ اس لیے بتایا کیونکہ فرشتوں کو ایک نئی مخلوق کے پیدا کئے جانے پر تعجب

ہو رہا تھا، فرشتوں نے کہا تھا کہ ہم سب آپ کی عبادت کرتے ہیں، یہ نبی مخلوق کیا کرے گی، اس کا کیا کام ہوگا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ راز میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔

علم کی خصوصیت کا مطلب یہ ہے کہ علم حاصل کیا جائے اور اس سے کام لیا جائے، اس کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو سکھا دیا، اس کے مزاج اور طبیعت میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ علم کو حاصل کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے، اور اسی بنیاد پر اس کو اختیار کی صلاحیت سے بھی نوازا، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور علم کو استعمال کرنے کے کام بھی کرے گا، اور اگر اختیار نہ ہوتا تو یہ کام انجام پانا بھی مشکل ہوتا، اس لیے کہ اگر اختیار نہ ہوتا تو اللہ جو چاہتا وہی کرتا چلا جاتا، اس لیے انسان کو اللہ نے اختیار دیا، اور یہی اختیار انسان کے لیے بہت بڑی ذمہ داری بن گیا، قرآن مجید میں اسی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھا کہ کیا تم اس ذمہ داری کو اٹھا سکتے ہو؟ پہاڑوں نے جواب دیا: ہمارے بس کا نہیں ہے، لیکن جب انسان سے اس کے بارے میں کہا گیا تو اس نے کہا کہ ہم اٹھالیں گے، کیونکہ انسان میں اللہ نے وہ خصوصیات رکھ دی ہیں جن سے وہ اس ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہے، لیکن انسان کا یہ کہنا

کہ ”اس ذمہ داری کو اٹھالیں گے“ یہ کچھ جلد بازی تھی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ظلوم و جہول کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی انسان جلدی بے قابو ہو جاتا ہے اور جلدی فیصلہ کر دیتا ہے، کیونکہ یہ ذمہ داری ایسی چیز تھی کہ جس کو اٹھانے سے پہاڑوں نے انکار کر دیا، مگر انسان نے رضا مندی کا اظہار کیا، لیکن جب اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے ”ہاں“ کر دی ہے تو ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اس کو نبھائیں، اور وہ اس طرح کہ ہم ایک صالح انسان بن کر دکھائیں، اللہ کی مرضی کو نافذ کریں، بہتر خصوصیات، بہتر اعمال اختیار کریں، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کو نافذ کریں، جس کا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعہ سے اظہار بھی فرمایا ہے۔

دین و شریعت کی جامعیت

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو ذمہ داری دی ہے، اس کو جو احکام دیئے ہیں وہ سب وہ ہیں جن کو وہ کر سکتا ہے، نہ کر سکنے والے احکام نہیں دیئے ہیں، اسی طرح یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی بذات خود کوئی ضرورت نہیں کہ انسان نیک بنے، انسان نیک بنے یا بد بنے اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اس کو ان سب چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، اس کی تو بے شمار مخلوقات ہیں، فرشتوں کی ان گنت تعداد ہے، سب اللہ کی عبادت میں لگے ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں

جو اللہ کی عبادت میں نہ لگی ہو، پرندے چرندے سب اللہ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں، البتہ ان کی عبادت کے طریقے الگ ہیں، اور ہمارا طریقہ الگ ہے، انسانوں کے لیے بھی اللہ نے مختلف طریقے رکھے، بنی اسرائیل کی عبادت کا طریقہ دوسرا تھا، ان سے پہلے کی قوموں کا الگ تھا، کسی کے یہاں صرف قیام تھا، کسی کے یہاں رکوع تھا، کسی کے یہاں سجدہ تھا، لیکن اس امت کے لیے اللہ نے ایسی شریعت عطا فرمائی جو جامع شریعت ہے، اس میں جو عبادت رکھی اس میں قیام بھی ہے، رکوع بھی ہے، سجدہ بھی ہے، قعدہ اور جلسہ بھی ہے، گویا اس امت کو اللہ نے ساری امتوں کا خلاصہ، ساری امتوں کا مجموعہ اور ایک اعلیٰ معیار بنا دیا، اسی لیے شریعت اس امت پر مکمل کر دی گئی، اور حضور ﷺ کی نبوت کے بعد کسی کی نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی، آپ ﷺ کو خاتم النبیین بنانا بھی محض کسی اعزاز و شرف سے نوازنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ دین کو آپ پر مکمل کیا، اس لیے آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی، دنیا کا بھی یہی دستور ہے کہ جب کوئی کام کسی کے ذریعہ سے صحیح طریقہ پر انجام پا رہا ہو تو اس میں کوئی دوسرا نیا آدمی لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح آپ پر شریعت مکمل کرنے کی وجہ یہی ہے کہ حضور ﷺ کی امت کے لیے آپ پر اللہ تعالیٰ نے شریعت کو جامع شریعت بنا دیا، لہذا اللہ تعالیٰ کی مشیت کو نافذ کرنا اور بہترین خصلتوں اور

بہترین صفات کا انسان بننے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر عائد کی، اب انسان نے ذمہ داری تو اٹھالی کیونکہ اس میں اٹھانے کی صلاحیت بھی تھی، لیکن اس نے اس ذمہ داری کی عظمت اور اس کے وزن پر غور نہیں کیا، اگر غور کر لیتا تو کچھ دیر کے لیے جھجکتا کہ واقعی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو نافذ کرنا، اپنے کو صالح ترین مخلوق بنانا یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس میں عزم و حوصلہ اور اپنی طبیعت پر پوری طرح قابو پانے اور توازن کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ان صفات کو اپنے نبی میں پوری طرح پیدا فرماتا ہے اور پھر اس کی نگرانی اور سرپرستی فرماتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ صبراً و حیاً معصوم تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری حفاظت ہو رہی تھی کہ بحیثیت انسان آپ سے کہیں ایسی بات سرزد نہ ہو جائے جو انسان کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں بہت متضاد اور ایک دوسرے سے ٹکرا جانے والی صفات رکھی ہیں، دل چاہتا ہے آرام اٹھانے، لذت حاصل کرنے اور مزے اڑانے کا، لیکن محافظ کہہ رہا ہے کہ ایسا نہیں کیا جاسکتا، تم اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اور وہ محافظ کون ہے؟ وہ ڈنڈا لے کر نہیں کھڑا ہے، بلکہ وہ اللہ کا حکم ہے، اگر تم اللہ کو اپنا پروردگار مانتے ہو، تو اس کی ہر بات تم کو ماننا ہوگی، اور یہ بات تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ بتادی کہ وہ اپنے بندوں کے ہر عمل سے واقف ہے۔

خلاصہ

آیت کے اخیر حصہ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو بھی جانتا ہے کہ تم نے کون سا عمل کس جذبہ سے کیا ہے، کس عمل میں تم کتنے مخلص ہو، کون سا عمل تم نے اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، کون سا عمل اپنے ذاتی فائدہ یعنی شہرت و عزت کے لیے کیا ہے، یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کو بخوبی معلوم ہیں، اس کو کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا، وہ ہر ایک کے اعمال سے واقف ہے، اسی لیے جس کے اعمال جس سطح کے ہیں اسی اعتبار سے آخرت میں ان کا بدلہ دیا جائے گا، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی سوسائٹی کو ایمانی سوسائٹی بنایا جائے، ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو دل سے مانا جائے، کیونکہ انسان جس کو دل سے مان لیتا ہے پھر اس کے خلاف عمل نہیں کرتا، گویا اعمال کی اصلاح کے لیے ایمان کی اصلاح ضروری ہے، دلوں میں ایمان راسخ ہونے کی ضرورت ہے، جب دل میں ایمان راسخ ہوگا تو ہمارے اعمال بھی اچھے ہوں گے، ورنہ اچھے اعمال بھی برے ہو جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے عمل سے خوب واقف ہے کہ کس نے کون سا عمل کس جذبہ و مقصد سے کیا ہے، اگر کسی نے غلط مقصد سے کام کیا ہے، لیکن وہ صالح مقصد باور کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مقصد سے خوب واقف ہے،

فرمادیا گیا کہ وہ تمہارے ایک ایک عمل کو جانتا ہے۔

سورہ حجرات کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کے عمدہ اخلاق ہونا چاہئیں، لغویات سے پرہیز کرنا چاہیے، اللہ و رسول کی محبت کو اور ان کے احکامات کو اپنے دل کی گہرائی سے ماننا چاہیے، اور یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، وہ دیکھ رہا ہے کہ ہمارا عمل کس حد تک صحیح ہے، اللہ تعالیٰ اسی حساب سے ہمارے عمل کا بدلہ دے گا۔

دعا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے دلوں میں ایمان جاگزیں فرما، ہم کو اپنی اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی توفیق عطا فرما، جو چیزیں تجھے ناپسند ہیں ان سے بچنے کی توفیق عطا فرما، ہم کو ہر وقت اپنا جائزہ لے کر خود اپنی اصلاح کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرما، دوسروں کے عیوب معلوم کرنے، ان کا چرچا کرنے سے ہم کو بچا، ہمیں اپنے عیوب معلوم کرنے اور ان کو دور کرنے کی توفیق عطا فرما، اے پروردگار! ہم مسلمان ہیں لیکن ہمارا اسلام سرسری اور ظاہری ہے اس کو ہمارے اعمال میں سرایت فرمادے، ہمارے اسلام کو ایمان والا اسلام بنا دے، ہمارے دل کی گہرائیوں میں وہ عقیدہ اور تصور بٹھادے جو تصور ایمان کا تصور ہے، اے پروردگار! ہماری بگڑی ہوئی زندگیاں ہیں، ہم نے جو غلط راستے

اختیار کئے ہیں ان کو صحیح راستہ پر واپس فرما، صحیح راستہ پر گامزن ہونے کی قوت عطا فرما، اے پروردگار! پوری امت کے حالات کو درست فرما، امت میں آپس میں جو رنجشیں، ٹکراؤ اور عداوتیں ہیں، ان کو دور کرنے کی توفیق عطا فرما، تاکہ ہم ایمانی اور اسلامی بھائی بن کر زندگی گزار سکیں، اے پروردگار! تیرے حکم کے مطابق ہماری زندگی ہو، اور ہم اس زندگی سے آخرت میں فائدہ اٹھا سکیں، اے اللہ! ہم میں صلاح و تقویٰ پیدا فرما، ہم کو عبد مجید بنا، ہماری اصلاح فرما، جس کی تو اصلاح فرمائے گا وہ کامیاب ہے، جس کی تو اصلاح نہ فرمائے وہ ناکام ہے، اے اللہ! ہم کو ناکام لوگوں میں شامل نہ فرما، کامیاب لوگوں میں شامل فرما، اے پروردگار! پوری امت پر فضل فرما، جن آزمائشوں سے امت گذر رہی ہے، ان سے نکلنے کی صورت پیدا فرما، اس سورت کا جو پیغام ہے اس کو دل میں رکھنے اور اپنے عمل میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرما، قرآن مجید کی ہدایات و رہنمائیوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ
و صحبہ أجمعین برحمتک یا أرحم الراحمین.

